علمائے ہند خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ، اُن کے اہلِ خاندان، حزبِ ولی اللّٰہی، سلسلۂ عالیہ احمدیہ،
نیز کاندھلہ، بڈھانہ، پھلت، تھانہ بھون، جھنجھانہ، دیوبند، رام پور، سہارنپور، کیرانہ، گنگوہ، نانوتہ
اور نواحی بستیوں کے علماء اور اہلِ کمال کے احوال و کمالات اور تحریرات و آثار کا مرقع

سہ ماہی

احوال و آثار

مُرتّب:

نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ

سہ ماہی

احوال و آثار

کاندھلہ

جلد اول

شمارہ نمبر ۳

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء ۵ رجب، شعبان، رمضان ۱۴۱۵ھ

زرِ تعاون

ہندوستان میں	فی شمارہ	سالانہ	خاص خریداروں سے
افراد سے:	بیس روپے -/20	پچھتر روپے -/75	ہندوستان میں:
لائبریریوں کیلئے	چالیس روپے -/40	ایک سو پچاس روپے -/150	دو سو پچاس روپے سالانہ -/250
بیرونی ملکوں سے	پانچ ڈالر $5	بیس ڈالر $20	بیرونِ ہند پچھتر ڈالر $75

پتہ:

دفتر احوال و آثار، حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مولویان، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر - ۲۴۷۷۷۵

Office: **AHWAL-O-AASAR,**
Mufti Ilahi Bakhsh Academy Maulvian, Kandhla.
Distt.Muzaffar Nagar-247775, (U.P.) India. **Phone: 013182-2369**

فہرست مضامین

احوال و آثار کے پاکستانی خریداروں کرم فرماؤں کی خدمت میں

پاکستان کے لیے احوال و آثار کی سالانہ قیمت تین سو روپے (۳۰۰) پاکستانی، یا دس امریکی ڈالر۔ اس پتہ پر قیمت روانہ فرما کر رسید رجسٹرڈ ڈاک سے ہمیں بھجوادیں۔ تبادلہ کے لیے رسائل اور اخبارات بھی اسی پتہ پر بھیجنا بہتر ہے:

جناب شبیر احمد خاں صاحب میواتی (مدیر نقوش میوات)

8/7 گلی روشن دین۔ محلہ حکیماں۔ صداقت پارک سانده خورد، لاہور پوسٹ کوڈ ۵۴۰۰۰

ایک صدمۂ عظیم

حضرت مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی

امیر تبلیغ کا سانحۂ ارتحال

احوال و آثار کا زیر نظر شمارہ شائع ہو چکا تھا کہ حوادث کی کڑیوں میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوا۔ امت مسلمہ کو اور دینی کام کرنے والوں کو علماء صلحاء کو تبلیغی خدمات سے وابستہ اصحاب کو، ہمارے سب ہی اعزہ و اہل خاندان کو اور خود راقم سطور کو ایک بڑا، نہایت بڑا اور اندوھناک سانحہ پیش آیا، جس نے ان سب ہی کو پژمردہ و نڈھال کر دیا یہ حادثہ امیر جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد انعام الحسن صاحب کاندھلوی کی اچانک وفات کا حادثہ ہے۔

اس حادثہ پر حضرت مولانا کی اولاد اور اہل خاندان تصویر غم بنے ہوئے ہیں، متوسلین و معتقدین نوحہ کناں ہیں اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تبلیغی جماعت کے کروڑہا مخلص افراد غم کا یہ کوہ گراں گرنے کی وجہ سے حیران ششدر اور وقف الم ہو کر رہ گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

حضرت مولانا انعام الحسن صاحب ممتاز عالم و محقق ماہر مدرس جید محدث، حضرت مولانا محمد الیاس کے زیر سایہ پروردہ و فیض یافتہ، حضرت مولانا کے لائق اعتماد شاگرد و خلیفہ مجاز، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے معتمد علیہ، لاکھوں اشخاص کے پیر و مرشد نیز دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے موثر اور طاقتور دینی تحریک، تبلیغی جماعت کے گزشتہ تیس سال سے امیر تھے، مولانا کی وفات سے امت ان سب نعمتوں سے بیک وقت محروم ہو گئی اور کہا جاسکتا ہے کہ:

کان بنیان قوم تهدما

حضرت مولانا انعام الحسن کا ضلع مظفر نگر کے اس قدیم اور معروف خاندان سے تعلق تھا جس میں حضرت مفتی الٰہی بخش مولانا مظفر حسین کاندھلوی وغیرہ تھے اور یہ خاندان فرط شہرت اور

دینی خدمات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے ۔ مولانا کے والد کا ننھیالی سلسلہ مولانا محمد الیاس کے والد ماجد، مولانا محمد اسماعیل سے وابستہ ہے، پدری نسب اس طرح ہے :

"مولانا انعام الحسن، خلف مولوی اکرام الحسن، بن مولانا حکیم رضی الحسن، بن مولانا حکیم محمد ابراہیم، بن مولانا نورالحسن، خلف مولانا ابو الحسن، بن خاتم مثنوی مولانا روم حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی"

کاندھلہ میں سنہ ۱۹۱۸ء میں ولادت ہوئی ۔ کاندھلہ کے ایک بابرکت استاد حافظ منگتو صاحب کی خدمت میں قرآن شریف پڑھا ۔ اپنے نانا مولوی حکیم عبد الحمید صاحب جب بڈولوی سے اردو پڑھی ۔ خوش خطی کی مشق کی اور فارسی کی ابتدائی کتابوں کا سبق لیا ۔ تقریباً ۹ سال کے تھے کہ مزید تعلیم کے لیے حضرت مولانا محمد الیاس اپنے ساتھ نظام الدین لے آئے تھے ۔ یہاں رہ کر مولانا محمد الیاس مولانا احتشام الحسن وغیرہ استادوں سے ابتداء سے دورۂ حدیث تک سب کتابیں پڑھیں دورۂ حدیث کے لیے مظاہرعلوم سہارنپور گئے ۔ مگر دورہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دہلی واپس بلا لیے گئے ۔ دورۂ حدیث خود حضرت مولانا محمد الیاس سے مکمل کیا ۔

مولانا محمد الیاس سے بیعت ہوئے، مراحل سلوک طے کئے اور اجازت خلافت سے نوازے گئے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں تبلیغی کام کی ذمہ داری سمبھالنے کے لیے اپنے جن لوگوں پر اعتماد و اطمینان ظاہر کیا تھا اس میں مولانا محمد انعام الحسن کا نام بھی شامل تھا ۔

حضرت مولانا محمد الیاس کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف امیر جماعت مقرر ہوئے، مولانا انعام الحسن مولانا محمد یوسف کے بچپن اور زمانۂ تعلیم سے ہمہ وقت رفیق، ہر ایک چھوٹے بڑے کام میں معاون دینی، ملی ذاتی امور میں شریک اور ہر قدم پر مدد گار رہے مگر اس رفاقت کے باوجود مولانا انعام الحسن سر گرم عوامی خدمات اور مجالس سے بظاہر غیر متعلق اور یکسو رہتے تھے، لیکن یہ غیر متعلق رہنا اپنے مزاج کی یکسوئی اور خاموش طبیعت کی وجہ سے تھا ورنہ اس وقت بھی مولانا انعام الحسن صاحب اپنے تدبر اور دانائی کی وجہ سے سمندر کی زیریں لہروں کی طرح تبلیغ کے پورے بالائی نظام کو متحرک اور سر گرم رکھنے میں مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ پورے طور پر شریک اور ان کے تمام مشوروں اور پروگراموں میں روح اور دماغ کی حیثیت سے شامل

اور کار فرما رہتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی وفات (اپریل ۱۹۶۵ء / ذوالحجہ ۱۳۸۵ھ) کے بعد جب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نے بحیثیت امیر جماعت مولانا انعام صاحب کا انتخاب اور ان کے نام کا اعلان کیا، اگرچہ اس وقت بہت سے لوگوں کو اس انتخاب پر سخت تعجب ہوا تھا یہاں تک کہ بعض لوگوں اس فیصلے کو تبلیغی کام کے لیے نامناسب فیصلہ بھی قرار دے دیا تھا، لیکن بعد میں سب ہی نے دیکھا اور اس کی تصدیق کی کہ حضرت شیخ کا فیصلہ نہایت مناسب اور کام کی ضرورت اور تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

حضرت مولانا محمد یوسف کی وفات کے بعد تبلیغ اور متعلقہ سب امور کی پوری ذمہ داری مولانا کے کاندھوں پر آگئی تھی۔ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے اس کام کی وسعت اور دائرہ عمل میں بے حد اضافہ کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک اس کی نگرانی و سرپرستی فرماتے رہے۔

مولانا اسلامی علوم، حدیث، فقہ اور نحو و لغت میں ید طولیٰ رکھتے تھے خصوصاً فہم حدیث میں ممتاز تھے، تقریباً چالیس سال تک درس اور پڑھانے کا بھی معمول رہا۔ سب کتابیں زیر درس رہیں۔ آخر میں خصوصاً حدیث اور صحاح ستہ کی کوئی کتاب پڑھاتے رہے مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ سلسلہ بھی بعد میں منقطع ہو گیا تھا۔ تصنیف و تالیف کا کم موقع ملا۔ تاہم صحیح بخاری کے تراجم پر ایک اعلیٰ درجہ کی محققانہ کتاب مرتب فرمائی تھی افسوس ہے کہ وہ نا تمام رہی۔ نیز تبلیغی جماعتوں میں مطالعہ اور دینی رہنمائی کے لیے مشکوٰۃ کے اہم ابواب کا خلاصہ تیار کیا اور اس کی مختصر شرح مرتب فرمائی مگر یہ کتاب بھی مکمل نہ ہو سکی۔ ایک اور بڑی علمی خدمت حضرت مولانا محمد یوسف کی شہرۂ آفاق تالیف حیات الصحابہ پر حاشیہ اور حل لغت لکھا۔ یہ حاشیہ شائع ہو چکا ہے۔

مولانا کی کئی سال سے صحت خراب تھی مگر صحت کی خرابی کے باوجود طویل طویل سفر غیر ملکی دورے۔ تقریر و خطابات کا سلسلہ اور دوسرے تمام معمولات سفر حضر میں بدستور جاری رہے۔ ہر سال پاکستان و بنگلہ دیش کا سفر ہوتا ہر دوسرے سال سفر حج کا معمول تھا، نیز امریکہ، یورپ اور ایشیا کے بیس سے زائد ملکوں کا مختلف اوقات میں سفر ہوا۔ افریقہ کے چند ملکوں میں بھی جانا ہوا۔ آخری سفر مظفر نگر کے ایک قصبہ کیروہ کے اجتماع کا ہوا تھا۔ وہاں سے وطن (کاندھلہ) میں ایک شب قیام کرتے ہوئے ۸ محرم ۱۴۱۶ھ کو نظام الدین واپسی ہوئی، یہیں ۱۰ محرم ہفتہ کی رات میں تقریباً ۹ بجے دل کا سخت دورہ ہوا، ڈاکٹروں نے ہر چند جد و جہد کی ڈاکٹر خلیل اللہ (جو امراض قلب

کے عالمی شہرت کے معالج ہیں) تقریباً تین گھنٹوں تک اپنے تمام وسائل کے ساتھ کوشش کرتے رہے مگر قضاء و قدر کا فیصلہ نافذ ہو کر رہا اور حضرت مولانا چند گھنٹوں کی علالت کے بعد شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے اس دارفان سے عالم جاودانی کو رخصت ہوگئے ۔ و کان امر اللہ قدراً مقدوراً ۔

یہ اچانک اور غیر معمول حادثہ صبر و شکیب کی بڑی آزمائش ہے ۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ سب اعزہ، اہل خاندان اور حضرت کے سب ہی متوسلین کو اس عظیم صدمہ کے برداشت کی ہمت و طاقت عطا فرمائے ۔ اور پس ماندگان کو اجر و صبر سے نوازے ۔ آمین یارب العالمین !

مولانا کی شب میں ڈیڑھ بجنے کے چند منٹ بعد وفات ہوئی اور دو بجے تک پوری دنیا میں یہ خبر پھیل گئی تھی، اور تھوڑی دیر بعد ہی فون فیکس اور آنے والوں کی اطلاعات آنی شروع ہوگئی تھیں ۔ موسم کی شدت اور بعض ضرورتوں کی وجہ سے شام کے چھ بجے نماز جنازہ اور تدفین طے ہوئی ۔ تدفین اور نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ہر طرف سے ہجوم امنڈ پڑے، ہمایوں کے مقبرہ کے قریب نرسری پارک کے وسیع میدان میں نماز جنازہ ہوئی ، مگر یہ نہایت وسیع میدان بھی آنے والوں کے لیے قطعاً ناکافی ثابت ہوا ، چاروں طرف دور دور تک صفیں پھیلی ہوئی تھیں محتاط اندازوں کے مطابق ڈھائی پونے تین لاکھ افراد جنازہ میں شریک ہوئے ، فرط غم سے بے قابو غیر معمولی ہجوم کی وجہ سے تمام انتظامات درہم برہم ہوگئے تھے جس کی بنا پر کچھ غلط فہمی ہوئی اور جنازہ کی نماز بہت دیر سے مغرب کے بعد ادا کی گئی اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے برابر میں تدفین عمل میں آئی ۔

رحمہ اللہ تعالیٰ و رضی عنہ

اداریہ

(ھادی زادہ غریق رحمت ۱۹۹۵ء)

حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ کی وفات حسرت آیات

محدث جلیل امام العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی معنوی اولاد تو ماشاء اللہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے اور امید یہی ہے کہ اس کے فیوض و برکات اور دینی خدمت کی روایات صدیوں تک جاری رہے گی۔ مگر حضرت کی جسمانی اولاد (خاص طور پر گنگوہ) میں حضرت کے فیوض و افادات کی شمع اس خانوادہ کے ایک بزرگ اور ایک ممتاز و برگزیدہ شخصیت حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی عرف حکیم تھو میاں صاحب کے ذریعہ سے روشن تھی افسوس ہے کہ یہ روشن چراغ بھی ۲۱ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ء پنجشنبہ کی صبح گل ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!۔

جمعہ ۲۲ شوال المکرم کی رات میں ہزار ہا افراد نے نماز جنازہ ادا کی اور حضرت کے قدموں میں دفن کئے گئے۔

حضرت حکیم صاحب کی وفات کسی ایک فرد کی وفات نہیں صرف ایک جید عالم دین اور حاذق طبیب کا حادثہ انتقال نہیں، بلکہ یہ ایک عہد کا اختتام ہے ایک دور کا انقطاع ہے، ایک روایت کا خاتمہ ہے اور ایک باب عقیدت و محبت کا انسداد ہے۔ حضرت حکیم صاحب حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب کے فرزند، حضرت مولانا گنگوہی کے پوتے خاندانی روایات کا نمونہ، علم و عمل کے جامع، فضل و کمال میں ممتاز اور طب و معالجات میں ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔

حکیم صاحب کی حضرت گنگوہی کی وفات (۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے پانچ سال بعد تقریباً ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء) میں ولادت ہوئی ابتدائی تعلیم وطن میں حضرت گنگوہی

کے بعض تلامذہ اور والد بزرگوار سے حاصل کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لیا تعلیم کے ساتھ طب کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کی تکمیل والد صاحب سے کی، دارالعلوم دیو بند سے فارغ ہونے کے بعد طب میں مزید معلومات اور مہارت حاصل کرنے کے لیے اطبائے دہلی سے استفادہ کیا۔

(حضرت گنگوہی کے شاگرد اور شہرۂ آفاق نباض و طبیب مولانا) حکیم عبد الوہاب صاحب غازی پوری (حکیم نابینا) کی خدمت میں تقریباً چھ مہینے نبض شناسی اور نسخہ نویسی کی مشق کی اس کے بعد وطن آگئے تھے۔ اور والد کی وفات (۲۸ محرم ۱۳۵۸ھ / ۲/ جولائی ۱۹۳۲ء) کے بعد ان کے مطب کو زینت بخشی اور پوری زندگی طب و معالجات اور طب کی تعلیم تدریس میں بسر فرمائی۔

دس بارہ شاگردوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جنھوں نے حکیم صاحب سے طب کی تعلیم پائی، جن میں آخری شاگرد حکیم خوشنود ربانی صاحب ہیں۔ جو دس بارہ سال سے مطب میں حکیم صاحب کے معاون و مددگار، نیز خادم خاص اور ہمہ وقت حاضر باش تھے، مولانا خوشنود صاحب نے حکیم صاحب کے ارشادات و افادات کا خاصہ ذخیرہ جمع کیا ہوا ہے۔

حکیم صاحب نے اصلاح باطن اور تربیت نفس کے لیے حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی سے استفادہ کیا اس رابطہ کا ذو الحجہ ۱۳۵۵ھ سے آغاز ہوا۔ جو بعد میں اصلاحی مکاتبت میں تبدیل ہو گیا تھا کئی سال تک طرفین کا سلسلہ، مراسلت جاری رہا حضرت مولانا تھانوی نے اس مراسلت کا نام "الکتاب المحمود فی خطاب ابن مسعود" تجویز کیا تھا، یہ مراسلت شائع ہو چکی ہے۔

حالانکہ حکیم صاحب کا حضرت تھانوی سے بیعت کا رابطہ تھا اور سلسلہ ارادت قائم تھا مگر حضرت تھانوی کے دل میں حکیم صاحب مرحوم کا جو احترام تھا اس کا حضرت کے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"بڑا لفظ القاب میں لکھوں تو آپ کو گوارہ نہ ہو گا چھوٹا مجھ کو گوارہ نہ ہو گا"

چند سال بعد حضرت نے مجاز صحبت سے نوازا، حضرت حکیم صاحب نے اس اجازت و خلافت کا ہمیشہ نہایت احترام فرمایا اور عوام کو دینی معلومات بہم پہونچانا گویا

اپنے مقاصد میں شامل کر لیا تھا۔ حکیم صاحب کی کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی تھی جو دینی تذکرہ اور علمی مباحث سے فارغ ہو، علماء و عوام دونوں کے حسب حال گفتگو فرماتے، عوام کو اصلاح و تربیت اور دینی معاملات کی صحیح نگرانی و عمل پر متوجہ کرتے اور علماء سے مختلف موضوعات پر ہم کلام رہتے تھے۔ خصوصاً جب ایسے اشخاص حاضر مجلس ہوتے جن کے ذوق مزاج اور علمی صلاحیت سے حکیم صاحب واقف ہوتے یا ان سے بے تکلفی پسند فرماتے تو اس وقت حکیم صاحب کی گل افشانی گفتار دیدنی و شنیدنی ہوتی تھی۔ بزرگوں کے واقعات متقدمین کے احوال اور اہم تصنیفات کی حیثیت ان پر تبصرے، تصوف و سلوک کے مراتب و طبقات، تصوف کی افادیت و ضرورت اور اس کے مختلف مدارج نیز اس کے اثرات گفتگو کا موضوع ہوتے مگر ہر مرتبہ یہ محسوس ہوتا گویا یہ نئی گفتگو ہے نیا موضوع ہے۔

اس کے علاوہ کبھی مراتب ایمان اور مطالبات ایمان کا ذکر ہوتا کبھی فقہی مسائل زیر بحث آتے کبھی ہندوستان کی شرعی حیثیت پر گفتگو ہوتی اور اس کے مباحث و دلائل کا ایک کارواں جاری ہو جاتا، کبھی ائمہ محدثین کے حالات، کبھی امام احمد بن حنبل کی سیرت مبارکہ، کبھی محب طبری اور ابن جوزی کی کتابوں کے مندرجات زیر گفتگو آتے اور ہر ایک موضوع پر شرح وبسط اور خاص انداز میں گفتگو کرتے، ان سب سے قطع نظر تین شخصیتیں ایسی تھیں کہ ان کے نظریات تعلیمات تصنیفات اور احوال سے گویا عشق تھا امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور علامہ اقبال شاید ہی کوئی علمی مجلس ایسی ہوتی ہو گی جس میں ان تینوں کا ذکر نہ آتا ہو۔

حضرت تھانوی کے افادات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے اقتباسات بلکہ صفحے کے صفحے ازبر تھے، نیز علامہ اقبال کا اردو و فارسی کا تمام کلام نوک زبان تھا، ایسی مجالس میں جن حضرات کو حاضری کا موقع ملا ہے وہ اس کی کیفیت اور لطف کو کبھی بھلا نہیں سکتے۔ عجیب مجلس ہوتی ابھی شاہ ولی اللہ کے علوم و حکم کی عقدہ کشائی ہو رہی ہے، ابھی حضرت تھانوی کے ارشادات و بصیرت

افروز ملفوظات کے مختلف پہلوں سے استفادہ ہو رہا ہے، ابھی علامہ اقبال کے اشعار سے استدلال ہو رہا ہے غرض الفاظ و معانی کا ایک آبشار جاری رہتا اور حاضرین و سامعین بے شمار فوائد معلومات لے کر اٹھتے۔

حضرت حکیم صاحب کی سیرت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت گنگوہی سے قربت اور سلسلہ ولی اللہی نیز علمائے دیوبند و سہارنپور میں حاصل غیر معمولی عظمت و احترام، حضرت تھانوی سے اجازت و استفادہ کی سعادت، اعلیٰ ترین علمی مقام (بہ قول حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہی) "یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہے کہ (حکیم تھو میاں صاحب) کو علمائے کرام کی صف اول میں جگہ حاصل ہے" (تمہید مکتوبات ثلثہ ۲) اور تحریر و خطابت کی نادر صلاحیت کے باوجود حکیم صاحب نے کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی کہ ان کا نام علماء کی صف میں آئے یا ان کو مرجعیت و مقبولیت حاصل ہو اور عوام ان سے رجوع کریں۔ ہمیشہ اپنے خاص اصولوں پر نہایت پختگی سے قائم رہے اور ایک شان کے ساتھ زندگی گذاری اور اساس عظمت و احترام کے باوجود نہ کسی اور کے معاملہ میں غیر ضروری دخل دیا نہ کسی کی تنقیص و غیبت گوارہ کی، نہ اپنی خاندانی نسبت و وجاہت کو اپنے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے فائدے کے لیے استعمال کیا، ان مکروہات سے بے نیاز ہو کر طب و معالجات میں مشغول رہے۔ اگرچہ حکیم صاحب کا علاج خاصا گراں بلکہ شاہانہ ہوتا تھا مگر اس کے لیے بھی انھوں نے کبھی ترغیب و اشتہارات کے ذرائع اور ایسا کوئی طور و طریقہ استعمال نہیں کیا جو خاندانی روایات اور علمی وضع کے خلاف ہو۔

ہر قسم کے افراد سے کشادہ پیشانی کے ساتھ بلا تکلف ملاقات کرتے اور ان کو حسب صلاحیت نصیحتوں اور افادات سے نوازتے، جن لوگوں سے طبیعت مانوس تھی یا ان پر عنایت کی نظر تھی ان کے لیے ملاقات کا کوئی خاص وقت متعین نہیں تھا جب حاضری ہوتی بشاشت کا اظہار فرماتے اور اسی طرح افادات سے نوازتے تھے کبھی یہ مجالس تین تین گھنٹے طویل ہو جاتیں مگر کم از کم راقم سطور نے (جس کو حکیم صاحب کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت ملی) کبھی محسوس نہیں کیا

کہ حکیم صاحب حاضرین سے کبیدہ خاطر ہیں، اگر کبھی طبیعت ناساز ہوتی تو فرما دیا کرتے تھے کہ آج طبیعت آمادۂ گفتگو نہیں، فلاں قصہ میں ذہن لگا ہوا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بعض اہل تعلق کو یاد فرماتے، عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی ملنے کو دل چاہتا ہے۔ ابھی عید الفطر کے بعد جناب توفیق احمد صاحب علوی کیرانوی (مظفر نگر) کو (جن سے خاص مراسم تھے اور ان کی فرمائش پر علمی افادات وتحریرات سے نوازتے رہتے تھے) دو مرتبہ یاد کیا، طبیعت خراب ہے، آئندہ کیا ہو خبر نہیں، جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ اور ملاقات ہوجاتی۔ پندرہ دن میں دو مرتبہ یہ پیام ملا لیکن توفیق صاحب خود بیمار تھے اس لیے حاضر نہ ہوسکے کہ حادثۂ وفات کی خبر آگئی۔

افسوس ہے کہ حکیم صاحب نے بے مثال علمی صلاحیت اور تحریر پر خاص قدرت کے باوجود تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی دو تین چھوٹے چھوٹے رسائل تالیفات میں سے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو حکیم صاحب کے وفور علم اور مطالعہ سے کوئی نسبت نہیں۔ حکیم صاحب کی غالباً سب سے پہلی تالیف سیرت قدوسیہ (تذکرہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی) ہے جو ۱۳۴۸ھ کی تالیف ہے جب حکیم صاحب دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پارہے تھے۔ دو مختصر سے رسائل جماعت اسلامی کے نظریات کی تردید میں ہیں، مکتوبات ثلثہ اور اجتماع گنگوہ ایک مختصر رسالہ حضرت گنگوہی کے متعلق چند سوالات کے جواب میں ہے جو بارہا شائع ہوا اور اب کتابی صورت میں مکتوب حقیقت کے نام سے چھپا ہے اور ایسی ہی ایک مختصر تحریر حضرت تھانوی کے لئے جس کا عنوان جامع المجددین ہے، مطبوعہ اثاثہ ہے، حکیم صاحب کی متعدد تحریریں تقریریں اور مکتوبات غیر مطبوعہ ہیں جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں نیز حکیم صاحب کے مکتوبات و افادات کا ایک اہم ذخیرہ جو اٹھارہ بیس خطوط پر مشتمل ہے (جس میں بعض خطوط سولہ سولہ صفحات کے ہیں) ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ یہ خطوط اسلامی عقائد و عبادات، تصوف اور دینی اصلاحی تحریکوں کے متعلق حکیم صاحب کے نظریات اور مسلمانوں کے موجودہ حالات اور نکبت و زوال کے اسباب اور اس کے علاج پر ہیں۔ ان میں متعدد ایسے

موضوعات و عنوانات پر گفتگو ہے جس پر حکیم صاحب کے جملہ مکتوبات و تحریرات میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ ایسے افادات کا ایک اور سرمایہ بھی ہمارے یہاں محفوظ ہے یہ وہ حاشیے اور تنقیدات و توضیحات ہیں جو حکیم صاحب نے جھنجھانہ سے شائع تین کتابوں:

(۱) صحیفۂ ابرار ترجمہ خیر البیان مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی

(۲) ترجمہ صحائف معرفت (ملفوظات شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی)

(۳) تاریخ محمودی (ترجمہ احوال سید محمود سبزواری جھنجھانوی)

پر تحریر کئے ہیں اور یہ حواشی و افادات اگرچہ بہت مختصر ہیں تاہم تبرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حکیم صاحب تقریر و خطابت میں بھی ید طولی رکھتے تھے اگرچہ تقریر کرنے کا بہت کم معمول تھا مگر جب کرتے تھے تو مسلسل گھنٹوں بولتے تھے۔ تقریر شروع ہوتی اور علم کا دریا رواں ہو جاتا، اگرچہ حکیم صاحب کی تقریر کے بعض مضامین عوام کی فہم سے اونچے ہوتے تھے مگر اس میں ایسی کشش اور کیفیت ہوتی تھی کہ تقریر بیچ میں چھوڑ کر اٹھ جانا عام سننے والوں کو بھی گراں گزرتا تھا۔ حکیم صاحب کا اگرچہ نہ سفر کا معمول تھا نہ عموماً تقریر کا، مگر کیرانہ والوں کی درخواست کو بہت کم رد کرتے تھے، حکیم صاحب کی (غالباً) اکثر تقریریں کیرانہ میں ہوئیں اور ان تقریروں کے حاضر افراد کا کہنا ہے کہ ایک موضوع پر تین تین گھنٹے تک مسلسل بولے جس میں عجیب ربط اور کیفیت ہوتی تھی، افسوس ہے کہ ان تقریروں میں سے کوئی تقریر محفوظ اور قلم بند نہیں ہے۔

دو ڈھائی سال پہلے تک چوراسی سال کی عمر کے باوجود حکیم صاحب کی صحت بہت اچھی تھی مگر گزشتہ سال ان کے داماد کا بہیمانہ قتل ہو گیا تھا۔ اس حادثہ کی وجہ سے صحت سخت متاثر ہوئی طویل عرصہ تک بیمار رہے مگر رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ سے پہلے صحت یاب ہو گئے تھے تاہم عمر کے تقاضہ اور بیماری کے اثر سے کمزوری تھی رمضان المبارک اور وفات کے دن تک شوال عافیت و سکون کے ساتھ گزارا، مگر ان دنوں میں موت کا ہمہ وقت استحضار رہتا تھا۔ وفات سے ایک روز پہلے

آیات قرآنی کی روشنی میں موت اور مابعد الموت پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے گفتگو فرمائی۔ جمعرات کی صبح تک معمول کے مطابق بیماری و علالت کا کوئی اثر نہیں تھا اپنے سب معمولات پورے کئے اور مطب میں آگئے، تقریباً نو بجے طبیعت ناساز ہوئی لیٹ گئے اللہ اللہ ذکر کرتے رہے، اسی حالت میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

ادارہ احوال و آثار اس حادثہ پر جو ایک بڑا دینی علمی حادثہ ہے مولانا کے اہل خانہ فرزندان گرامی (قیس مسعود صاحب ایڈوکیٹ کراچی اور راشد مسعود ایڈوکیٹ لاہور) نیز جملہ متعلقین و متوسلین کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ سب کو اجر و صبر سے نوازے اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور مولانا کو ان کے آباء صالحین کے ساتھ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

ایزد پاک مغفرت کرے ۱۹۹۵ء

اس شمارہ کی کمپوزنگ گذشتہ شماروں سے مختلف ہے اس مرتبہ حواشی مضامین کے ساتھ ساتھ صفحہ کے نیچے دیئے گئے ہیں۔ متعدد بزرگوں اکابر اور اکثر قارئین کی یہی فرمائش تھی اگرچہ اس کی وجہ سے حسن تحریر متاثر ہوا ہے مگر جس کمپیوٹر پر پہلے شمارے چھپے اس میں مضامین کے ساتھ ساتھ حواشی کی سہولت دستیاب نہیں ہوئی حواشی کی موجودہ ترتیب اور یہ کمپوزنگ کس حد تک پسند ہے۔ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

افسوس ہے کہ یہ شمارہ بھی بہت دیر سے شائع ہو رہا ہے اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

نورالحسن راشد
٦ محرم الحرام ١٤١٦ھ

بدعت کی حقیقت اور اس کی قسمیں

تالیف و تحریر : مولانا مفتی صدر الدین آزردہ

تمہید ترجمہ اور حواشی : نور الحسن راشد کاندھلوی

تمہید : آخر عہد مغلیہ میں جب خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ کے برگزیدہ اصحاب دہلی کو الوداع کہہ گئے تھے اور بہت سی پرانی خانقاہیں اور مدرسے بے رونق و پژمردہ ہو چلے تھے ۔ اس وقت دہلی کی عظمت کا چراغ جن عالی مرتبت شخصیتوں کی بدولت منور و ضوفشاں تھا اور جن کے علم و کمالات کی خوشبو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے گذر کر بیرون ہند تک پہنچی ہوئی تھی اور جن کی کشش دور دور سے اہل کمال اور علم کے دلدادہ طلباء کو دہلی آنے پر مجبور کرتی تھی، ان میں ایک نمایاں شاید سب سے نمایاں نام (غالب کے)۔

"یار وفا شعار، علامہ روزگار، ختم العلماء المتبحرین، مولوی مفتی صدر الدین خاں صاحب بہادر، صدر الصدور سابق، دہلی، المتخلص بہ آزردہ" (۱)

کا ہے۔

مولانا مفتی صدر الدین خلف مولوی لطف اللہ کشمیری کا دہلی کے اس ممتاز ذی علم اور بااثر و باحیثیت خاندان سے تعلق تھا، جس کی اصل زاد و بوم کشمیر تھا، لیکن اس خاندان کے متعدد افراد سرکاری ملازمتوں اور تجارت کے سلسلہ میں دہلی میں مقیم تھے (۲) کہا جاتا ہے کہ یہ خاندان اکبر کے دور حکومت میں

۱۔ یہ الفاظ مرزا غالب کے ہیں نامہ غالب بنام عبدالرزاق شاکر، عود ہندی معلی ۱۶۱۔
(ناشر، شیخ مبارک علی، لاہور : بلاسنہ)

۲۔ معتمد خاں بدخشی نے ایسے تقریباً بیس کشمیری علماء اور اہل مناصب کا ذکر کیا ہے، جو مغل دربار میں عہدہ و منصب پر فائز تھے اور دہلی میں رہتے تھے اور ۱۱۰۱ھ مطابق ۹۰-۱۶۸۹ء سے سنہ ۱۱۶۱ ہجری کے درمیان ان کی وفات ہوئی۔
تاریخ محمدی۔ مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی (علی گڑھ : ۱۹۶۰ء)

کشمیر سے اس نواح میں منتقل (۳) ہوا، مگر اس وقت تک اس کا تجارت کا مشغلہ رہا، بعد میں اس خاندان کے ایک فرزند خیر الدین ابوالخیر نے تعلیم حاصل کی اور اپنے زمانہ کے ممتاز علماء میں شمار کیے گئے (۴) مولوی خیر الدین نے ۱۸ صفر سنہ ۱۱۴۵ھ (اگست سنہ ۱۷۳۲ء) میں وفات پائی ان کے بیٹے مولانا امان اللہ علم و عمل میں اپنے والد سے بھی فائق اور نامور ہوئے (۶) ان کو خصوصاً فقہ حنفی میں بڑا کمال حاصل تھا ان کے بیٹے مولانا سعد الدین صادق تھے وہ بھی ذی علم اور جید استعداد کے مالک تھے لیکن عمر نے وفا نہیں کی، مولانا امان اللہ نے مورخہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ (فروری ۱۷۲۹ھ) کو شہادت پائی، مولانا سعد الدین صادق اس کے اڑتیس دن بعد ۲۲ ذی الحجہ کو عالم آخرت کو سدھارے اور اپنے والد کے پہلو میں دفن کیے گئے (۷)

۳۔ یہ جناب عبدالرحمان پرواز اصلاحی کی اطلاع ہے اور اس کے لیے انھوں نے معارف اعظم گڑھ کی جلد ۵۹ کے شمارہ ۶ (۱۹۴۷ء) کا حوالہ دیا ہے۔ مگر اس مضمون کا عنوان اور مضمون نگار کا نام تحریر نہیں کیا۔

۴۔ تاریخ محمدی (۸۳) میں مولانا خیر الدین کے سنہ وفات کا جو اندراج ہے اس میں ان کو امرائے عصر میں شمار کیا ہے، ان کے عالم ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۵۔ تاریخ محمدی۔ حوالہ بالا۔

۶۔ جن تذکرہ نگاروں نے مولانا امان اللہ کا ذکر کیا ہے وہ سب مولانا کے علوئے مرتبت اور کمال علم پر متفق ہیں۔ مثلاً:

الف۔ تاریخ محمدی ۱۰۴۔

ب۔ حدائق الحنفیہ، مولوی فقیر محمد جہلمی، مرتبہ خورشید احمد خاں ۴۶۱ (لاہور: بلاسنہ)

ج۔ تذکرہ علمائے ہند، فارسی، مولوی رحمان علی (نولکشور لکھنؤ: ۱۹۱۴ء)

د۔ نزہۃ الخواطر، مولانا سید عبدالحی حسنی ۴۱۔۴۲ ج ۶) حیدر آباد: ۱۳۹۸ھ)

ہ۔ تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی، ترجمہ و حواشی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری ۱۲۰۔۱۲۱ (کراچی: ۱۹۶۱ء)

۷۔ حدائق الحنفیہ ۴۶۱۔

تذکرہ علمائے ہند، فارسی ۲۶۔

نزہۃ الخواطر ۹۷ ج ۶

ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ۲۱۸۔

عبدالرحمن پرواز اصلاحی نے لکھا ہے کہ مولانا لطف اللہ مولانا امان اللہ کے حقیقی بھائی تھے (۸) (اور آزردہ امان اللہ کے بھتیجے) مگر یہ اطلاع مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر مولانا لطف اللہ مولانا امان اللہ کے بھتیجے ہوں گے، بہر حال ان کا اس خانوادہ سے خاص قریبی تعلق اور خاندانی رشتہ ہے۔

اس خاندان کے متعدد افراد حضرت شاہ ولی اللہ، ان کے صاحبزادگان اور اس خاندان کے دوسرے علماء کے دامن گرفتہ اور شاگرد تھے خود شاہ عبدالعزیز نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"مولوی صدر الدین صاحب کہ از فضلائے نامدار این بلد ماہولہ اندودر اکثر فنون عقلی و نقلی از عربیت و ادب و اصول فقہ و کلام، ہم فنون فارسی مہارت دارند و اکثر مراجعت تحقیقات نفیسہ علوم درفقیر خانہ نمودہ اند، ومع ہذا نسبت ارادت و اتحاد بافقیر موروثی دارند و جد امجد ایشاں از فضلائے معتبرہ خلص اصحاب و تلامذہ درجناب حضرت والد ماجد فقیر بیوونند" (۹)۔

مولوی صدر الدین صاحب کہ جو اس علاقہ کے ممتاز ترین علماء میں سے ہیں اور اکثر علوم نقلیہ و عقلیہ، ادب، اصول فقہ و کلام نیز فارسی فنون میں مہارت رکھتے ہیں، اور اکثر علوم کی نادر تحقیقات میرے گھر میں رہ کر کی ہیں اور ان سب کے ساتھ میرے اور میرے آباء و اجداد کے ساتھ خاندانی (موروثی) عقیدت (بیعت کا سلسلہ) اور نسبت رکھتے ہیں۔ اور ان کے دادا معتبر فاضلوں اور میرے والد ماجد کے مخلص احباب اور شاگردوں میں تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ سے مفتی صاحب اور ان کے اجداد سے کئی نسلوں تک بلا انقطاع تلمذ اور استفادہ کے تعلقات رہے کیونکہ لفظ موروثی کا اطلاق (عموماً) اسی وقت ہوتا ہے جب کہ باپ دادا سے اس وقت تک ان دونوں خاندانوں کے درمیان رابطہ کی کوئی کڑی منقطع نہ ہوئی ہو۔

۸۔ مفتی صدر الدین آزردہ، پرواز اصلاحی ۱۳۔
۹۔ پرواز اصلاحی ۱۵۔ ۱۴ (بحوالہ اتحاف النبلاء۔ نواب صدیق حسن خاں ۲۶۱)

اسی خاندان کی ایک ممتاز شخصیت مولانا رشید الدین دہلوی (۱۰) تھے۔ اسی خانوادہ میں مولوی لطف اللہ کے گھر میں ۱۲۰۴ھ (۹۰-۱۷۸۹ء) میں ایک بیٹا تولد ہوا۔ جس کا نام محمد صدر الدین رکھا گیا۔ لفظ چراغ کے ابجدی اعداد (۱۲۰۴ھ) سے تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے (۱۱)۔

ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا لطف اللہ سے پڑھیں، پھر مولانا فضل امام خیر آبادی، حضرت شاہ عبد القادر حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالعزیز سے تعلیم حاصل کی آخر الذکر تینوں اساتذہ سے درس کے علاوہ بھی استفادہ کا موقعہ کثرت سے ملا، آخر میں حضرت شاہ محمد اسحٰق سے حدیث پڑھی (۱۲) اور تعلیم کے بعد سرکاری (انگریز) ملازمت سے وابستہ ہوئے جلد ہی صدر الصدور ہو گئے تھے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (ذی قعدہ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ) تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔

جنگ آزادی کی شرکت کی وجہ سے ملازمت سے برطرف کیے گئے تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد ضبط ہوئی جس میں بہت بڑا، نہایت گراں قدر کتب خانہ بھی تھا۔ جیل گئے سخت اذیت اٹھائی بعد میں نصف جائداد و گذاشت ہوئی۔ آخر

۱۰۔ مولانا رشید الدین، خلف امین الدین، بن وجیہ الدین کشمیری دہلوی۔ ابتدائی کتابیں مفتی علی کبیر بنارسی سے پڑھیں۔ اور سب کتابوں کا حضرت شاہ رفیع الدین سے درس لیا نیز حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ عبد العزیز رحمہم اللہ سے طویل استفادہ کیا۔ علوم میں فائق اور ممتاز علماء و متکلمین میں شمار کیے گئے۔ متعدد اہم تصنیفات یادگار ہیں۔ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی ـــــ علم و عمل (ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی) ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی، حواشی پروفیسر قادری ۲۴۹-۲۵۰ ج ۱۔ (کراچی: ۱۹۷۰ء)

و نزہۃ الخواطر ۱۸۰-۱۸۱ ج ۷، (حیدر آباد: ۱۳۹۹ھ)

۱۱۔ ۱۲۰۴ھ میں علم و علم کے بعض چراغ گل ہوئے اور بعض نئے چراغ روشن ہوئے اسی سال حضرت خواجہ محمد زبیر نقشبندی کے نامور خلیفہ اور جانشین شاہ عبدالعدل کی وفات ہوئی، اسی سال میں تحفہ اثنا عشریہ لکھی گئی اور اسی سنہ میں مفتی صدر الدین آزردہ کی ولادت ہوئی، سب کی تاریخ "چراغ" کے اعداد (۱۲۰۴ھ) سے معلوم ہوتی ہے۔

۱۲۔ نزہۃ الخواطر ۲۲۶ ج ۷۔

عمر میں ایک عرصہ تک حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں مقیم رہے۔

مفتی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک مرکز علوم و فنون اور ہر قسم کے مباحث و اختلافات میں ہر طبقہ خیال کے اصحاب کے مرجع اور محبوب و معتمد علیہ تھے جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا مفتی صاحب اس کے حل کی کلید ثابت ہوتے، علمی مسائل میں اختلاف ہوتا تو وہ قول فیصل سناتے، فقہی موضوعات پر بحث ہوتی تو ان کی رائے پر فیصلہ ہوتا مناظرہ کی بات ہوتی تو وہ حکم بنائے جاتے۔ علم و ادب کی محفل ہوتی تو وہ میر مجلس ہوتے شعر و ادب کی مجلس جمتی تو وہ صدر میں جلوہ نشین ہوتے، دہلی کے ایوان اقتدار میں رسائی کی بات ہوتی تو وہ میر کارواں شمار ہوتے اور یہ ان کی جامعیت کا کمال اور اعتدال و توازن کا اثر تھا کہ اگر وہ ایک طرف لال قلعہ کے مسند نشینوں میں محترم تھے تو ادھر انگریز افسران اور اہل کاروں کے یہاں بھی لائق تکریم شمار ہوتے تھے غرض دہلی بلکہ شاید شمالی ہند کی کوئی علمی مجلس ایسی نہیں تھی جہاں ان کا چرچا نہ ہو اور کوئی دریائے علم ایسا نہیں تھا جس کے سوتے مفتی صاحب کی ذات میں نہ مل گئے ہوں، مولانا عبدالحی حسنی نے خوب لکھا ہے کہ:

"و کان نادرة دهره فی کل علم لاسیما الفنون الادبية، اذا سئل فی فن من الفنون ظن الرائی و السامع انه لا یعرف غیر ذلک الفن و حکم ان احدا لا یعرف مثله، ولذلک تری العلماء یحسبونه علماً مفردا فی العلم، و الشعراء یزعمون انه حامل لواء الشعر، والامراء یرجعون الیه فی کل امر (۱۴)۔

"اپنے زمانے میں ہر علم و فن میں بے مثال تھے خصوصاً فنون ادبیہ میں، جب ان سے کسی فن کے متعلق سوال کیا جاتا تو دیکھنے اور سننے والے سمجھتے کہ انھوں نے پوری عمر میں یہی فن حاصل کیا ہے، کوئی اور شخص اس علم کو ان کے برابر نہیں جانتا اور یہی وجہ ہے کہ علماء ان کو صرف

۱۴۔ نزھۃ الخواطر ۲۲۶ ج ۷۔

بلند پایہ عالم خیال کرتے ہیں اور شعراء کا گمان ہے کہ وہ صرف (بڑے) شاعر تھے اور امراء ہر معاملہ میں ان سے رجوع کرتے تھے"

مولانا حسنی کے ان الفاظ اور تعارف کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، جب یہ معلوم ہو کہ مفتی صدر الدین آزادہ کے لیے مولانا حسنی نے جو الفاظ لکھے ہیں تقریباً اسی طرح کے الفاظ ابن الزملکانی نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متعلق تحریر کیے تھے۔ (۱۴)

مفتی صاحب کے اساتذہ، ان کے عہد کے برگزیدہ علماء، اور ممتاز معاصرین مثلاً فضل حق خیر آبادی، مرزا غالب، سر سید احمد خان، مصطفی خاں شیفتہ، قادر بخش صابر، کریم الدین پانی پتی اور نصر اللہ خاں خویشگی وغیرہ نے بہت بلند اور غیر معمولی الفاظ میں مولانا آزردہ کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کی تحریروں کا خلاصہ اور حاصل یہی ہے کہ مفتی صاحب اپنے دور کے ایک منفرد اور ایسے جامع کمالات شخص تھے جن کی مثال دور دور تک نہیں تھی، اور اقتباسات و تحریرات سے قطع نظر یہاں صرف دو اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں جس میں پہلا مولانا رشید الدین خاں کا ہے، مولانا رشید الدین خاں (مفتی صدر الدین سے بہت بڑے، اس عہد کے جلیل القدر علماء میں نمایاں اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے ابتدائی دور کے ممتاز ترین شاگردوں میں سے تھے اور ان کی مفتی صاحب کے اساتذہ کی سی حیثیت ہے وہ) لکھتے ہیں:

"ذو خلق عظیم، وطبع کریم و سجیة سریة، و همة علیة، مامن علم الا اصاب مشکلاته، و مامن فن الا غاص فی بحار تحقیقاته، اماالادب فقد شیدار کانه واما الفقه فقد ---- بنیانه، واما المعقول فمنه والیه، و معول ارباب الصناعته الیه، ذخرالا فاضل فخر الاماثل، صدر الا فاضل زین المحافل مولانا المولوی محمد صدر

۱۴ - ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان ۹۱۴ ج ۳ (صدیقیہ، بھوپال: ۱۲۹۵ھ) نیز تاریخ دعوت و عزیمت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۳۰-۲۹ ج ۲۔ (اعظم گڑھ: ۱۳۷۷ھ)

الدین لازال ظل افاضتہ علی رؤس المستفیدین' (۱۵) ۔

"وہ نہایت بلند وسیع اخلاق اور نہایت کریم طبیعت والے، اعلیٰ خصلتوں اور عادتوں سے مالا مال۔ بہت عالی ہمت (شخص ہیں) کوئی علم ایسا نہیں کہ جس کی مشکلات کو انھوں نے حل نہ کرلیا ہو، اور کوئی فن ایسا نہیں ہے جس کے بحر تحقیقات کے وہ شناور نہ ہوں ۔ علم ادب کی عظمت میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا ہے اور فقہ کی بنیاد ان سے مضبوط ہوئی، معقولات کا فن انہی کے دم سے ہے اور انہی کے لیے ہے ۔

فاضلوں کے سردار محفلوں کی زینت، مولانا محمد صدر الدین ۔ ان کے فیوض کا سایہ مستفیدین کے سر سے کبھی زائل نہ ہو ۔"

مفتی صاحب کے قریب العہد ایک نامور عالم و مدرس اور مفتی صاحب کے ایک شاگرد مولانا مفتی سعد اللہ رام پوری کہتے ہیں :

قد فاق مولانا علی اقرانہ	بل من تقدمہ من الا علام
صدر الافاضل والا ماجد کلہم	بحر العلوم و فوق کل امام
مولای فی کل الا مور و سیدی	وانا الغلام لہ وای غلام
ھو قبلۃ الآمال کعبۃ منیتی	ملجای فی الدارین کھف انام
یا لیتنی یوما اقبل ایدیا	من ذلک المخدوم قبل حمامی
لازال غیث فیوضہ متقاطرا	ماناحت الورقا، فوق بشام (۱۶)

ترجمہ : مولانا اپنے اہل زمانہ پر ممتاز و فائق ہو گئے بلکہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو ممتاز علماء کے پیش رو ہیں ۔

سب فاضلوں اور ممتاز لوگوں کے سردار، علوم کا دریا اور رہنماؤں میں سب سے آگے ۔

---

۱۵ ۔ ریاض الفردوس، مولوی محمد حسین خاں شاہجہاں پوری ۔ (مولف : ۱۲۷۶ھ) نسخہ ۱۶۴ ۔ ۱۶۵ حصہ اول (نولکشور لکھنؤ : ۱۸۶۶ء ؟) ریاض الفردوس کے پیش نظر نسخہ کے ابتدائی چند صفحات موجود نہیں ہیں ۔ مطبع مجتبائی دہلی کی فہرست سنہ ۱۸۸۲ء سے معلوم ہوتا ہے کہ "ریاض الفردوس کا پہلا حصہ عربی میں، دوسرا فارسی میں، تیسرا اردو میں ہے اور یہ کتاب سنہ ۱۸۶۳ء کی مطبوعہ ہے ۔ (فہرست ۱۸۸۲ء ۳۵)

۱۶۔ ریاض الفردوس حصہ دوم ۲۹۵ ۔ ۲۹۶ ۔

جملہ معاملات میں میرے آقا اور میرے سردار۔ میں ان کا غلام ہوں اور کیسا غلام؟ وہ تمام آرزؤں کا مرکز اور تمناؤں کی قبلہ گاہ۔ دنیا و آخرت میں میری پناہ گاہ اور کل عالم کی پناہ گاہ۔

کاش میں وفات سے پہلے اس مخدوم کے ہاتھ چوموں۔

ان کے فیوض کی بارش ہمیشہ برستی رہے۔ اس وقت تک جب تک کہ خوشبو دار درختوں کے پتے حرکت کرتے (سرسراتے) رہیں۔

مفتی صاحب کی پوری زندگی، بلکہ کہنا چاہیے اس کا ایک ایک لمحہ علمی دینی مصروفیات اور اہل علم و ادب کی سرپرستی میں گذرتا تھا۔ کس درجہ کی مصروفیت تھی اس کا کچھ اندازہ مفتی صاحب کی ایک تحریر سے ہوتا ہے فرماتے ہیں:

"شکر ہے اس پروردگار کا کہ جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا، مقدمات اصلی کا فیصل کرنا۔ منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتوی دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبائے مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزار ہا کاغذ کا دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کا پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا، مجالس شادی اور غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب (بختیار کا کی) کی زیارت کو اکثر جانا۔ الغتوں کو ساتھ لے جانا اور ان کی دعوت کا اہتمام کرنا، یہ اشغال ایسے تھے کہ رات دن اسی میں غلطاں پیچاں تھا اور جان کو ایک دم آرام نہ تھا، نہ کھانے کی حلاوت، نہ سونے کا مزہ، نہ طاعت کا لطف، نماز پنجگانہ بھی حسب عادت ادا ہوتی تھی، وجوہ فیصلہ کے لکھتے لکھتے ظہر کا وقت آجاتا تو وجوہ ڈگری و ڈسمس کے عین نماز میں وسوسہ

انداز ہوتے، تنخواہ اور آمدنی رجسٹری کی جب آتی تو ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتی۔ اگرچہ لوگوں کو میرے ہونے سے اس کام پر نفع تھا، مگر میری ذات کو کچھ فائدہ اور تمتع دینا کا نہ تھا۔" (۱۷)

مفتی صاحب کی ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو تقریباً بیاسی سال کی عمر میں وفات ہوئی، درگاہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی میں دفن کیے گئے۔ (۱۸)

مفتی صاحب کے ایک شاگرد ظہور علی ظہور دہلوی نے قطعہ تاریخ کہا جس کے ایک شعر سے مفتی صاحب کا سنہ ولادت اور وفات دونوں معلوم ہو جاتے ہیں:

چراغش ہست تاریخ ولادت کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود (۱۹)

بے مثال تبحر علمی اور جامعیت و کمال کے باوصف مفتی صاحب کی تحریرات و تصانیف بہت کم دستیاب ہیں اس وقت تک کل بارہ تصانیف و مولفات کا علم ہوا ہے جن میں سے اکثر صرف ایک ایک مرتبہ چھپی ہیں اور اب بالکل ناپید ہیں ان کی ایک مختصر فہرست یہاں درج کی جا رہی ہے:

۱۔ منتہی المقال شرح حدیث لا تشد الرحال
۲۔ واقعۃ الفتویٰ
۳۔ الدر المنضود فی حکم امراۃ المفقود
۴۔ رسالہ در تحقیق دعا بین الخطبتین
۵۔ رسالہ در امکان نظیر
۶۔ حاشیہ دیوان متنبی

۱۷۔ اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، ڈاکٹر محمد ایوب قادری ۲۲۱، ۲۲۲۔ (لاہور: ۱۹۸۸ء)

۱۸۔ واقعات دار الحکومت دہلی، مولوی بشیر الدین احمد ۹۴ ج ۲ (آگرہ: ۱۹۱۹ء)

۱۹۔ تذکرہ علمائے ہند۔ رحمان علی، فارسی ۹۳-۹۴ (لکھنؤ: ۱۹۱۴ء) ایک اور فقرۂ تاریخ وفات لالہ سری رام نے نقل کیا ہے "چراغ الم" خمخانہ جاوید ۵۲ ج ۱۔ (دہلی: ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۸ء) مگر اس کے عدد درست اور مطابق واقعہ نہیں ہیں۔

۷۔ کتاب در صنائع و بدائع

۸۔ رسالہ منطق

۹۔ شرح ضابطۃ التھذیب

۱۰۔ جواب شبہ "شبہ لزومیت اعتباریہ فی العقول المجروۃ"

۱۱۔ حاشیہ بر میر زاہد

۱۲۔ تذکرۂ شعراء　(۲۰)

ان میں سے منتہی المقال، الدر المنضود، رسالہ امکان نظیر اور تذکرۂ شعراء ایک ایک مرتبہ اور واقعۃ الفتوی دو مرتبہ چھپی ہے اور (منہتی المقال کے علاوہ) ان کے تمام ایڈیشن ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں سے حاشیہ دیوان متنبی بھی موجود ہے، حاشیہ میر زاہد کا بھی ایک نسخہ تھا وہ اس وقت دستیاب نہیں

اس کے علاوہ مختلف فقہی علمی موضوعات پر فتاوی یا مختصر تحریرات اور عربی فارسی میں متعدد مکتوبات جو اپنے معاصرین اور شاگردوں کے نام تحریر فرمائے تھے دریافت ہیں۔

ان فتاوی اور تحریرات میں سے ایک تحریر یا رسالہ یہاں درج کیا جا رہا ہے، یہ تحریر مفتی صاحب کے ایک ممتاز اور عزیز ترین شاگرد مولانا نورالحسن (خلف مولانا ابوالحسن بن حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی۔ ولادت ۱۲۲۷ھ وفات ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء) کے ذخیرہ کے باقی ماندہ آثار میں سے ہے۔ مولانا نورالحسن کم سنی اور ابتدائی زمانہ تعلیم سے اپنے بزرگوں اور استادوں کی تحریرات و تالیفات اور طرح طرح کی علمی کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے خصوصاً اپنے سب ہی استادوں کی تصنیفات

۲۰۔ مفتی صاحب کی چند کتابوں اور تحریرات کا عبدالرحمان پرواز اصلاحی نے تعارف کرایا ہے (آزردہ ۱۴۴، ۱۴۲) اس عنوان کے کچھ اور گوشے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے ایک مضمون ("مفتی صدر الدین آزردہ کی کچھ نایاب و کم یاب تحریریں" مجلہ غالب نامہ نئی دہلی، جولائی: ۱۹۸۱ء) سے عیاں ہوتے ہیں اور اس موضوع پر راقم سطور کے بھی دو مضامین شائع ہو چکے ہیں "باقیات آزردہ" (چند تلامذہ، تالیفات، غیر مطبوعہ فتاوی اور خطوط) مجلہ غالب نامہ، نئی دہلی، جنوری: ۱۹۸۳ء ۲۰۱ تا ۲۲۱۔ نیز مکتوبات آزردہ بنام مولانا نورالحسن کاندھلوی۔ غالب نامہ، جنوری ۱۹۸۵ء ۶۴ تا ۸۹۔

ان کے علمی افادات، فتاوی، تحریرات، و مکتوبات اکٹھا کرتے رہتے تھے، اس کی وجہ سے مولونا کے کتب خانہ میں اس قسم کی کتابوں کا ایسا وسیع اور بیش بہا ذخیرہ فراہم ہوگیا تھا جو اپنی مثال آپ ہی تھا۔ افسوس ہے کہ حالات کی ناساعدت کی وجہ سے اس ذخیرہ کا خاصا بڑا حصہ ضائع اور منتشر ہو گیا ہے، جو چند چیزیں اس وقت تک موجود ہیں ان میں مفتی صاحب کی غیر مطبوعہ اور مطبوعہ تالیفات کے چند نسخے، مولانا نورالحسن کے نام مفتی صاحب کے تین گرامی نامے اور دو مختصر رسائل یا تحریرات ہیں جن میں سے ایک تحریر یہاں پیش کی جارہی ہے۔ یہ تحریر بدعت کی حقیقت، اس کی اقسام اور اس موضوع کے مفید مباحث پر مشتمل ہے، اس رسالہ کے ترقیمہ کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"نمقه العبد المستكين محمد صدر الدين عفى عنه و ذلک فی صفر سنه ۱۲۶٦هجری"

ان الفاظ اور اس تحریر کی مفتی صاحب کی بعض اور تحریرات سے مطابقت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مفتی صاحب کے قلم کی لکھی ہوئی ہے، اور میری معلومات کے مطابق غیر مطبوعہ ہے میرے ایک دو مضامین کے علاوہ اس کا آج تک کہیں، حوالہ و تذکرہ بھی نہیں آیا ہے۔

اس تحریر کی کئی طرح سے اہمیت ہے مفتی صدر الدین کی ایک علمی یادگار، اور تیرہویں صدی کے علمی ورثہ کا ایک قابل قدر حصہ اور خود مولف (آزردہ) کے قلم سے ہے نیز سنت و بدعت کے موضوع پر ایک مفید جامع اور بصیرت افروز تحریر ہے۔

راقم سطور نے اس کے ترجمہ کی کوشش کی ہے اور مولف کے جو مآخذ دستیاب ہوئے ان سے مراجعت کر کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں، جو کتابیں دستیاب نہیں ہوئیں ان کی مطابقت سے معذوری رہی، ترتیب یہ ہے کہ پہلے مفتی صاحب کی اصل تحریر کا عکس نظر سے گذرے گا، بعد ازاں اس کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔

چه منقح نمایند علمای محققین در صحت این کلام که از طرق عدیده نقل کنند

و هو ان للبدعة معنیین لغویا هو المحدث مطلقا عادة او عبادة و هذه

هی المقسم فی عبارة الفقهاء والعلماء من ائمة الاجتهاد و غیرهم

یعنون بها ما احدث بعد العصر الاول للاحتیاج الیه و ثانی شرعیا

خاصا هو الزیادة فی الدین او النقصان منه الحادثان بعد الصحابة

و آنچه بدعت شرعیه منکره و مذموم و ضلالت است و بمعنی که اهل علم

آن بسوی در واجب و مندوب و مباح و مکروه و حرام کرده اند بدعت لغویه است

نه بدعت شرعیه آن شبهت مکر ضلالت بینوا توجروا

این کلام فی نفسه صحیح مثبت و هیچ سخن در او اول آن ما ذکر کند

و تقسیم منفی آن مغز است چه حاصل این است که بدعت لغویه

عبارت است از محدثات مطلقه و همین است تقسیم احکام خمسه

من فقہا و علماء مراد داشتہ اند باین بدعت کہ منقسم احکام

انقسام بچیزی کہ حادث شدہ بعد صدر اول بسبب احتیاج

بسوئی او و از اجلی بدیہیات است کہ این معنی بدعت نعنی ما احدث

بعد الصدر الاول للاحتیاج الیہ ہرگز معنی لغوی بدعت نیست

و محض اصطلاحی است پس تفسیر بدعت لغوی کہ محدثت مطلق است

باین معنی خاص اصطلاحی بتقیید چگونہ درست تواند شد دیگر آنکہ اگر

از مقسم ہمین معنی مراد باشد کما یدل علیہ قولہ یعنون بہا این معنی

لامحالہ حسن است چہ ہر چیزی کہ حادث شدہ بعد صدر اول

بسبب احتیاج شرعی بآن ضرور است کہ حسن باشد پس

تقسیم آن بسوی بدعت حسنہ و سیئہ چگونہ صحیح خواہد بود

و الا نیز م تقسیم الشئی الی نفسہ و الی غیرہ ظاہر است بطریقہ

محاورہ مراد درین عبارت غلطی واقع شدہ یا در نقل آن چیزی

تصرف بوجود آمدہ و تقسیم بدعت لغوی بسوی اقسام خمسہ

نیز لطایف بعضی از اهل ادب است که صاحب زهرة الحیوة

الدنیا بوده گویند یا چنین گفته اند و راقم این سطور نیز بارها از زبان

بسیاری از طلاب همچنان نقل نموده اند که مذهب فقهای متبوع

از ائمه اربعه باشد چه کسیکه ادنی مناسبت از علوم شرعیه

دارد میداند که این کلام فقها و اهل اصول نیست زیرا که وجوب

و ندب و کراهت و حرمت باتفاق اهل اصول و فقها از احکام

شرعیه است بلکه اباحت هم چنانکه در مسلم است الاباحة

حکم شرعی لانه خطاب الشرع تخییرا انتهی پس بدعت ممنوع

و مستحبه که قسم بدعت لغوی باشد مندوب و مستحب شرعی

خواهد بود یعنی محدث با خود از اصل شرعی که بر فعل آن

ثواب است و در ترک آن عقاب نیست و همین است

معنی بدعت حسنه شرعیه نهایت کار این بوده است که بدعت

اصطلاحی شرعی هم که نزد صاحب این تقسیم منحصر در ضلالت است

یکی از اقسام بدعت لغوی خواهد بود یعنی بدعت محرمه و مکروهه پس کدام
فایده مترتب گردید بر احداث این تقسیم و ایجاد اصطلاحی خلاف
مصطلح جمیع غفیر از مفسرین و محدثین و جماهیر فقها و اهل اصول و متکلمین و
از علمای اهل اسلام چه محصل نزاع درین صورت بجز نزاع لفظی دیگر
چیزی بر نیاید و در هر حال قایل شدن به بدعت حسنه در دین اسلام موجب افساد
خواه بدعت را بسوی حسنه و سیئه تقسیم کنند خواه بدعت را منحصر در سیئه نمایند
و بدعت حسنه را داخل سنت شمارند و خواه بدعت لغوی را منقسم به حسنه
قرار دهند و بدعت اصطلاحی شرعی را در ضلالت منحصر سازند و منشاء
فساد عظیم درین تقسیم این است که بنا علی مذهب قابلیه در بیشتر امور
محدثات تا بحدی از آن میشود زیرا که محدثات عام است و شامل است بدع اعتقادیه
و قولیه و عملیه را چنانکه بتصریح کرد ملا علی قاری و دیگر شراح در شرح این حدیث
و تمامی این قولی است که نقل آن نه از کتاب است نه از سنت نه از اقوال
صحابه و تابعین نه از اجماع نه از ائمه اربعه مجتهدین نه از کتب معتبره مستند در فقه

مذاهب اربعه و غیرهم محققین تحقیق بنموده‌اند که اعتقاد داشتند و قبول نموده و بعد

بدعت سیئه و حرام است نزد قائل این تقسیم که بدعت غیر سیئه را اعتقاد او

منحصر در ضلالت است و عدم نقل آن از آنحضرت صلعم و صحابه کرام را

دلیل حرمت اشیا میدانند چه جای آنکه از تابعین و اتباع تابعین و ائمه

مجتهدین هم منقول نباشد بالجمله هیچ قول را در دینیات که محض تخریج و

محدث است که اثری از آن در شرع و کتب مذاهب مدونه نیست مدار فتوی

و حکم شرعی نمودن خود بدعت سیئه است بر مسلمات قائل این قول جدید

پس ابطال بدعت سیئه از آن چگونه تواند شد و ما هو الا ابطال الشیء بنفسه و

باعث این جمله خرابیها عدم واقفیت است از معنی بدعت و سنت که بسبب تعدد معانی

و تفاسیر مختلف آن در کلام علمای شریعت خصوصاً روایت عامه فقهای و محدثین بالغرض نحو هم

و آنچه از تتبع کتب معتبره فقه و اصول و تحقیقات علمای محققین و تدبر و فکر خود و سماعت از

اساتذه کاملین محقق شده این است که بدعت لغةً آن است که باشد بتخریج علی غیر

مثال سابق من ابتدع الامر اذا احدثه و منه بدیع السموات والارض ای موجدهما

علی غیر مثال سابق کذا فی فتح المبین شرح الاربعین وشرعا احداث ما لم یکن فی

عہد رسول اللہ صلعم قال السید فی حاشیتہ والقاری فی شرح علی المشکوۃ

البدعۃ فی الشرع احداث ما لم یکن فی عہد رسول اللہ صلعم بعد ان تخصیص کردہ

بما احدث علی خلاف الحق المتلقی والمعروف عن النبی صلعم او عمل او حال المعاندۃ

بنوع شبہۃ لاستحسان وجعل دینا قویما وصراطا مستقیما کذا فی البحر والنہر والشمنی وشرح

النخبۃ او ما احدث علی خلاف امر الشارع ودلیلہ الخاص او العام کذا فی فتح المبین

او الزیادۃ فی الدین والنقصان منہ کذا فی النہر قال البرجندی واما المبتدع فہو الذی

نقص من الدین شیئا او زاد فیہ ما لیس منہ وحاصل ہمہ واحد اعنی ما لم یکون لہ

اصل فی الشرع بل مجرد احداث بلا مناسبۃ شرعیہ او وجود اصل لہ اخذا منہ قولہ صلعم

من احدث فی امرنا ہذا ما لیس منہ فہو رد حیث قیدہ بقولہ ما لیس منہ کذا فی شرح

شرح النخبۃ قال البغوی فی شرح السنۃ یعنی ما احدث علی غیر قیاس اصل من اصول

الدین وبدعت بمعنی ہیئت امر مخالفات گاہی حسن متواند شد و مقابل حقیقی آن سنت

باسنت کہ اہل آنرا اہل سنت وجماعت گویند ومخالفان آنرا مثل روافض

خوارج و معتزلہ را اہل بدع و اہوا نامیدہ و جہلہ فرق نکنند در میان فسق من حیث الافعال

و بدعت و ہر فاسق را از اہل سنت مبتدع گویند و اگر شبہہ بیابی آنرا، بلی اگر در شرع صحیح باشد

قیاس آن بر اصلی از اصول دین پس آن بدعت سیئہ نیست بلکہ داخل سنت است

و در کلمات فقہاء جماعہ آنرا بدعت حسنہ نام نہند فی فتح الباری و المراد بہا ما احدث

و لیس لہ اصل فی الشرع و یسمی فی عرف الشرع بدعۃ و ما کان لہ اصل یدل علیہ الشرع

فلیس ببدعۃ انتہی و منقسم بسوی سیئہ و حسنہ بدعت شرعیہ بمعنی اول است و بدعت لغویہ بہ

بالمعنی الاعم و ہی احداث ما لم یکن فی عہد رسول اللہ صلعم آمدہ بدعت شرعیہ بالمعنی الاخص

قال الجزری فی النہایۃ البدعۃ بدعتان بدعۃ ہدی و بدعۃ ضلالۃ فما کان فی خلاف

ما امر اللہ بہ و رسولہ فہو فی حیز الذم و الانکار و ما کان واقعا تحت عموم ما ندب اللہ الیہ

و حض علیہ او رسولہ فہو فی حیز المدح انتہی و بدعت در کل بدعۃ ضلالۃ بہ تفسیر عام

مخصوص است و بتفسیر دوم احتیاج بتخصیص نیست. و قال الشیخ ابن حجر المکی ما احدث

و خالف کتابا او سنۃ او اجماعا او اثرا فہو البدعۃ الضلالۃ و ما احدث من الخیر

و لم یخالف شیئا من ذلک فہو البدعۃ المحمودۃ و الحاصل ان البدع الحسنۃ متفق

نسیاً مماً وعلم بلزوم من فعلہ مخدور شرعی وان السبع المثبتۃ ہی خالف سنیا
عن ذلک صریحاً او التزاماً وبالجملۃ ہی منقسمۃ الی الاحکام الخمسۃ انتہی لسیم
الخ تمام بدعت لغوی بحسنہ وسیئہ وانحصار آن ہم در سیئہ ونہ موقع چنانکہ در
کلام فقہاء وعلمای دین واقع است ہر دو صحیح است یعنی انکہ منقسم است
در بدعت بمعنی اول است وانکہ منحصر است بمعنی ثانی است وہر دو معنی بدعت
شرعی است ومستعمل نزد اہل شرع ومنقول از علمای مذہب چنانکہ دانستی
انتہی فتعدد ظہر الحق وزہق الباطل وارتفع التخالف بین اقوال العلماء ر
حصل التوفیق بتوفیق اللہ سبحانہ وہو اعلم بالصواب نمقہ العبد
المسکین محمد صدر الدین عفی عنہ ہذا نکتہ نے صفر ۱۲۶۶ کو ہجر پر یہ

ترجمہ تحریر مفتی صدر الدین آزردہ در تحقیق بدعت و اقسام بدعت

کیا فرماتے ہیں علمائے محققین اس بات کی صحت میں جو طریقہ محمدیہ میں درج ہے (۱) وہ یہ ہے کہ بدعت (کے ایک اور معنی لغت میں ہیں) ہر ایک نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں وہ چاہے عادت کے طور پر ہو یا عبادت کے طور پر، یہی تقسیم فقہا علماء اور اہل افتاء وغیرہ کی تحریروں میں ہے بہ سب اس سے دو چیزیں مراد لیتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی عہد کے بعد کی ضرورت کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ اور شریعت کی اصطلاح میں ایسی ہر ایک کمی زیادتی کو جو حضرات صحابہ کے دور کے بعد اسلام میں ظاہر ہوئی بدعت کہتے ہیں (۲) اور یہ کہ بدعت شریعت کی اصطلاح میں جو بدعت ہے وہ نہایت بری، بد دینی اور گمراہی ہے اور جس بدعت کی تقسیم واجب مندوب مباح مکروہ اور حرام سے کی گئی ہے وہ بدعت کی لغوی تقسیم ہے نہ کہ شرعی اور بدعت شریعت کی نظر میں گمراہی و بد دینی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، وضاحت کیجئے اور اجر پائیے۔

جواب:۔ یہ بات درحقیقت صحیح نہیں ہے اور کچھ معنی نہیں رکھتی، اس کا پہلا حصہ آخری حصہ کی ضد اور تفسیر مفسر (کے منشا) کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ بدعت سے مطلقاً ہر ایک نئی چیز مراد ہے اور یہی (تقسیم) پانچ قسموں پر منقسم ہے یعنی ہر وہ چیز جو پہلے دور کے بعد کسی ضرورت کی وجہ سے ایجاد ہوئی (بدعت ہے) اور یہ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ بدعت کے یہ معنی کہ جو ابتدائی

۱۔ الطریقۃ المحمدیہ، للشیخ محمد بن پیر علی البرکوی ۹ (مطبع عزت آفندی، استنبول: ۱۳۰۹ھ)

۲۔ بدعت کے لغوی اور شرعی معنی اور متعلقہ مباحث کے لیے: الاعتصام للشاطبی ج ۱۸۱ (مطبع مصطفےٰ محمد قاہرہ، مصر: بلاسنہ) نیز کشاف اصطلاحات الفنون، قاضی محمد اعلی تھانوی ۱۴۲ ج ۱ (سہیل اکیڈمی لاہور: ۱۴۱۳ھ)

دور کے بعد ایجاد ہوئی اس کی ضرورت کی وجہ یہ یقیناً بدعت کے لغوی معنی نہیں ہیں صرف اصطلاحی ہیں لہذا لغت کی اصطلاح میں بدعت کے معنی ہی نئی چیز ہیں، ان معانی کو خاص اصطلاحات سے مقید کرنا کس طرح درست ہے؟۔

دوسرے یہ کہ اگر تقسیم سے یہی معنی مراد ہوں جیسا کہ (سوال کے الفاظ) معنون بہا سے معلوم ہوتا ہے تو یہ معنی بلاشبہ قابل قدر ہیں کیونکہ ہر وہ چیز جو قرون اولیٰ کے بعد ایجاد ہوئی اس کی شرعی (مذھبی) ضرورت کی وجہ سے لازم ہے کہ وہ حسن ہو لہذا اس کی بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ پر تقسیم کس طرح صحیح ہو گی (اور یہ تقسیم کی جاتی ہے) تو ایک ہی چیز کی تقسیم اس کی ذات کی طرف اور اس کے غیر کی طرف کرنی ہو گی (جو صحیح نہیں ہے)۔

بہ ظاہر موءلف طریقہ محمدیہ کو اس عبارت میں غلطی ہوئی یا اس کی نقل میں کوئی تحریف ہو گئی ہے۔

اور بدعت لغوی کی پانچ قسموں پر تقسیم بعض ادیبوں کے لطائف میں سے ہے مولف زھرۃ الحیوۃ الدنیا اور دوسرے ادیبوں نے اسی طرح کہا ہے اور راقم سطور نے بھی بے شمار طلبا کے سامنے اسی طرح نقل کیا ہے، بدعت کی یہ تقسیم فقہاء کا مسلک یا ائمہ اربعہ سے منقول نہیں ہے۔

ہر وہ شخص جو اسلامی علوم سے معمولی بھی مناسبت رکھتا ہے جانتا ہے کہ یہ (بدعت کی تقسیم) فقہا اور اہل اصول کا فرمان (اور تحقیق) نہیں ہے، کیوں کہ اہل اصول اور فقہاء کا اتفاق ہے کہ واجب، مستحب، مکروہ اور حرام ہونا، بلکہ مباح ہونا بھی احکام شرعیہ میں سے ہے، جیسا کہ مسلم الثبوت میں ہے۔

"الاباحتہ حکم شرعی لانہ خطاب الشرعی تخییر (۲)

اباحت ایک حکم شرعی ہے کیونکہ اس میں شریعت نے اجازت کی گفتگو کی ہے۔

لہذا بدعات مستحبہ اور مندوب چاہے بدعت کی لغوی تقسیم ہو۔ مندوب

۲۔ مسلم الثبوت (المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام) ۴۵ (مجتبائی دہلی: ۱۳۲۰ھ)

اور مستحب شرعی (شمار) ہوگی۔ مراد یہ ہے کہ یہ نئی چیز اصل احکام شریعت سے لی گئی ہے، جس کے کرنے میں ثواب ہے اور چھوڑ دینے میں گناہ نہیں ہے۔ بدعت سیئہ اور حسنہ کے یہی معنی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ بدعت شرعی بھی اس تقسیم کے کرنے (اور ماننے) والے کے یہاں (صرف) گمراہی تک محدود ہے کیونکہ یہ بھی بدعت لغوی، یعنی بدعت حرام اور بدعت مکروہ کی ایک قسم ہو جائے گی پس اس تقسیم کو ماننے سے، امت کے محدثین و مفسرین کی بہت بڑی جماعت، جمہور فقہاء، علماء اصول و کلام کی اصطلاحات کے خلاف ایک اصطلاح ایجاد کرنے سے کیا فائدہ، کیونکہ اس اختلاف کا لفظی اختلاف کے علاوہ کوئی حاصل نہیں۔ بہر صورت مذہب اسلام میں بدعت حسنہ کا ماننا ضروری ہوگا چاہے بدعت حسنہ اور سیئہ کی تقسیم کریں۔ چاہے بدعت کو بدعت سیئہ میں منحصر رکھیں اور بدعت کو حسنہ کو سنت میں شمار کر لیں۔ چاہے بدعت لغوی کو پانچ حصوں پر منقسم قرار دیں اور بدعت شرعی کو بدراہی (وبے دینی) کے لیے خاص کر دیں۔ اس سب کے باوجود، اس تقسیم میں بڑا جھگڑا یہ ہے کہ اس اصول کے ماننے والے پر:

"شر الامور محدثاتہا" (۴)

کی وعید ثابت ہوتی ہے کیونکہ محدثات (کا لفظ) عام ہے جو تمام بدعات اعتقادی، بدعات قولی وفعلی کو شامل (اور احاطہ کیے ہوئے) ہے جیسا کہ ملا علی قاری (۵) اور دوسرے شراح حدیث نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کی ہے۔

یقیناً یہ قول (بدعت کا پانچ قسموں پر تقسیم ہونا) کتاب اللہ سے نقل ہے نہ حدیث شریف سے، نہ حضرات صحابہ کرام اور تابعین کے کلام سے، نہ اجماع امت سے، نہ چاروں ائمہ اور فقہاء مجتہدین سے، نہ ہی چاروں مذاہب کی فقہ کی معتبر و

۴۔ رواہ مسلم عن جابر مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ، ۲۷ عکس نسخہ نور محمد، اصح المطابع۔ (رشیدیہ دہلی: بلاسنہ)

۵۔ ملا علی قاری نے بدعت کی ان تینوں قسموں پر مرقات شرح مشکوۃ میں لفظ "محدثاتہا" کے تحت بحث کی ہے۔ مرقات ۲۱۶ ج ۱ (امدادیہ، ملتان: بلاسنہ)

دستیاب کتابوں سے، اور ہر ایک وہ چیز جو قرن اول کے بعد وجود میں آئی ہو چاہے وہ اعتقادات سے متعلق ہو یا قول و فعل سے بدعت سیئہ اور حرام ہے، کیوں کہ اس شخص کے خیال میں جو اس تقسیم کو مانتا ہو کہ بدعت شرعی صرف بددینی اور گمراہی ہے اور وہ شخص اس عقیدہ یا قول و فعل کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہ ہونے کو اس کے حرام ہونے کا ثبوت سمجھتا ہے، چہ جائیکہ یہ چیز تابعین، اتباع تابعین اور ائمہ مجتہدین سے بھی منقول نہ ہو. بہر حال اس جیسی باتوں کو جو من گھڑت اور نو ایجاد ہیں ان کا شریعت مقدسہ اور مذاهب (فقہ) کی مرتب و مدون کتابوں میں کہیں نام و نشان تک نہیں ہے، اس کو فتویٰ کا مدار اور حکم شرعی قرار دینا (اس قول کو ماننے والے کے ترجیحات کی رو سے) خود بدعت سیئہ ہے لہذا اس سے بدعت سیئہ کی تردید کیوں کہ ہو سکتی ہے اور یہ ابطال الشئی لنفسہ (کسی چیز کی تردید خود اسی چیز سے) کے مترادف ہے جو غلط و بے حقیقت ہے۔

ان سب خرابیوں کی وجہ (شرک و بدعت کے) حقیقی معنوں سے ناواقفیت ہے جو کہ اس کی متعدد توضیحات اور علمائے شریعت خصوصاً اہل فتویٰ کی عام روایت میں مختلف تشریحات کی وجہ سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ہوتی رہتی ہے اور جو کچھ فقہ و اصول (فقہ و حدیث و تفسیر) کی معتبر کتابوں کی تلاش و جستجو سے اور علماء محققین کی تحقیقات سے اور اپنے غور و فکر اور اپنے کامل الفن استادوں (کی تحقیقات و ارشادات) سے واضح ہوا ہے (وہ یہ ہے) کہ لغت میں بدعت اس چیز کو کہتے ہیں جو اس سے پہلے موجود کسی نمونہ اور مثال کے بغیر بنائی گئی ہو، اسی قسم سے ہے بدیع السموات و الارض یعنی ان دونوں کو بنانے والا بغیر کسی نمونہ اور مثال کے، (جیسا کہ فتح المبین شرح الاربعین میں ہے) ۔ (۶)۔

اور شریعت کی اصطلاح میں (ہر اس چیز کو بدعت کہتے ہیں) جو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہیں تھی، سید شریف جرجانی نے

۶ - فتح المبین شرح الاربعین ۹۷-۹۴ (مطبع میمنیہ احمد البابی الحلبی، ازہر، مصر: ۱۳۰۷ھ)

مشکوۃ کے حاشیہ میں (۷) اور ملا علی قاری نے مشکوۃ کی شرح میں لکھا ہے:

"البدعة الشرعی احداث مالم یکن فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم" (۸)

بدعت شریعت کی اصطلاح میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو رسول اکرم صلی علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھی۔

اس کے بعد اس کی تخصیص کی گئی (کہ بدعت ہر وہ عقیدہ ہے) جو اس حق کے خلاف ہو جو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور معروف ہو (آپ کے قول مبارک سے ہو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یا حال سے، اور یہ چیز مخالفت کے طور پر نہ ہو بلکہ یا شبہ کے طور پر ہو یا ---- سمجھتے ہوئے ہو، اور اسی نظریہ کو قدیم روایت اور صراط مستقیم کہا گیا ہے۔ یہی بحرالرائق، نہر الفائق، شمنی اور شرح نخبۃ الفکر میں ہے:

"بما احدث علیٰ خلاف الحق المتلقی والمعروف عن النبی صلی الله علیه وسلم او عمل او حال، لالمعاندة بل بنوع شبهة او استحسان وجعل دینا قویما و صراطا مستقیما۔" (۱۰)

"(بدعت وہ ہے جو) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت حق کی صاف اور معروف چیزوں کے خلاف ایجاد کی گئی ہو۔ چاہے وہ عمل سے ہو یا حال سے۔ اور یہ ایجاد کسی مخالفت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ کسی شبہ کی وجہ سے ہو یا اس کو اچھا سمجھتے ہوئے ہو اور اس کو دین کی قدیم روایت اور صراط مستقیم قرار دیا گیا ہو۔"

اور بدعت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ہر وہ چیز جو جناب رسول اکرم

۷۔ حاشیہ مشکوۃ میر سید شریف جرجانی (جس کے آخری اوراق مولانا نورالحسن کاندھلوی نے ۱۲۷۳ھ میں نقل کر کے مکمل کیے) قلمی ورق ۵۸ نسخہ ذاتی۔

۸۔ مرقات ۲۱۶ ج ا

۹۔ بحرالرائق ۲۵۸ ج ۲ عکس، ایچ ایم سعید (دارالمعارف، بیروت)۔

۱۰۔ شرح نخبۃ الفکر، ملا علی قاری (مطبع اخوت، استنبول: ۱۳۲۷ھ)

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم (اور مرضی کے) یا اس کی کسی خاص یا عام دلیل کے خلاف ہو، جیسا کہ فتح المبین میں ہے:

او ما احدث علی خلاف الامر الشارع و دلیله الخاص او العام (۱۱)

جو شارع علیہ السلام کے خلاف یا آپ سے ثابت کسی خاص یا عام دلیل کے خلاف ایجاد کی گئی ہو۔

یا اس سے دین میں کچھ زیادتی اور نقصان ہوتا ہو جیسا کہ نہر الفائق میں ہے:

او الزیادة فی الدین او النقصان

یا وہ دین میں اضافہ یا کمی ہو۔

اور برجندی نے کہا ہے:

اور بدعتی وہ ہے جس نے دین میں کچھ کمی کی ہو یا اس میں کچھ ایسی چیز بڑھائی ہو جو دین سے نہیں ہے (۱۲)

اور ان سب (تصریحات اور) اقتباسات کا حاصل یہی ہے کہ بدعت وہ طریقہ (دینی) ہے جس کی شریعت میں اصل نہ ہو اور بغیر کسی شرعی مناسبت و حقیقت کے (ایجاد اور) دین میں داخل کی گئی ہو۔ بدعت کی یہ تعریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی سے لی گئی ہے جس نے ہمارے اس کام میں کوئی نئی چیز ایجاد کی وہ مردود (ناقابل قبول) ہے اسی وجہ سے اس کو مالیس منہ سے مختص کیا ہے، جیسا کہ شرح شرح نخبۃ الفکر میں ہے۔

علامہ بغوی نے شرح السنہ میں کہا ہے کہ بدعت وہ ہے جو دین کے اصول میں سے کسی اصل کے بغیر ایجاد کی گئی ہو اور اس معنی میں جو بدعت ہے وہ گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے وہ بھی حسن نہیں ہو سکتی وہ در حقیقت سنت کے مقابلہ (اور ضد) میں ہے۔ وہ سنت جس کے ماننے والوں (اور عمل کرنے والوں)

۱۱۔ فتح المبین حوالہ بالا ۱۱۷۔

۱۲۔ برجندی (شرح النقایۃ مختصر الوقایہ، للشیخ عبدالعلی بن محمد البرجندی کتاب الصلوۃ، ۱۱۷ ج ۱ (نولکشور لکھنو: ۱۳۲۲ھ)

کو اہل سنت کہا جاتا ہے اور اس کے مخالفین کو رافضی، خارجی، معتزلہ اور اہل بدعت و اہل ہوا جیسے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جاہل لوگ (من حیث الافعال) عملی حیثیت سے فسق اور بدعت میں فرق نہیں کرتے اور اہل سنت میں سے ہر فاسق کو بدعتی کہتے ہیں۔ (۱۳)

اور اگر اس چیز کی شریعت میں کوئی اصل ہو اور اس (نئی چیز) کا اس اصل دین پر قیاس صحیح ہو تو وہ چیز شرعاً بدعت نہیں ہے بلکہ (جزوی طور پر) داخل سنت ہے ان لوگوں (اہل شریعت) اور ان کے ماننے والوں کے نزدیک اس کو بدعت حسنہ کہتے ہیں فتح الباری میں ہے:

واالمرادبه مااحدث وليس له اصل فى الشرع ويسمىٰ فى عرف الشرع بدعة، وماكان له اصل يدل عليه الشرع فليس ببدعته۔ انتهىٰ (۱۴)

اور اس سے مراد وہ نو۔ایجاد چیزیں ہیں جن کی شریعت میں کچھ اصل موجود نہ ہو۔ اور اسی کو شریعت کی اصطلاح میں بدعت کہتے ہیں۔ اور اگر اس کام یا عمل کی کوئی ایسی اصل موجود ہو جس کا شریعت سے ثبوت ملتا ہے تو وہ بدعت نہیں ہے۔

بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ میں جو بدعت تقسیم ہے یہ وہی بدعت ہے جو بدعت کے لیے عام طور پر استعمال ہے یعنی وہ شے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہیں تھی یعنی بدعت شرعی خاص معنی میں۔ علامہ (ابن الاثیر) جرزی نے نہایہ میں کہا ہے:

البدعة بدعتان، بدعته هدىٰ و بدعة ضلالة، فما كانت فى خلاف ماامرالله به ورسوله فهوفى حيز الذم والانكار، فما كان

۱۳۔ شرح السنۃ بغوی تحقیق شعیب الارناؤط (بیروت: ۱۳۹۴ھ)۔

۱۴۔ فتح الباری ۲۵۳ ج ۱۳ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار نشر الکتب الاسلامیۃ (لاہور: ۱۴۰۱ھ)

واقعا تحت عموم ماندب الله اليه او حض عليه او رسوله .
فهو فى حيز المدح انتهى (۱۵)

بدعت کی دو قسمیں ہیں بدعت ہدی اور بدعت ضلالہ جس بدعت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات کی مخالف ہوتی ہو تو وہ بدعت نہایت بری اور لائق مذمت ہے اور جو بدعت ان روایات کے عموم میں آتی ہو، جن کو اللہ تعالیٰ نے گنجائش عطا فرمائی ہے یا ان کی ترغیب دی ہے تو ایسی بدعت نہایت لائق تعریف ہے۔

اور اس عام تعریف کے مطابق کل بدعۃ ضلالۃ میں بدعت خاص مراد ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق تخصیص کی ضرورت نہیں۔

شیخ ابن حجر مکی کا قول ہے کہ جو کام نیا ہو اور قرآن و سنت اجماع امت اور آثار سلف کے خلاف ہو وہ بدعت ہے، اور جو کام کسی اچھے مقصد کے لیے ایجاد ہوا ہو اور ان میں سے کسی بھی چیز کا مخالف نہ ہو بدعت محمودہ ہے۔(۱۶)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ بدعت حقہ وہ ہے جو مذکورہ اصول میں سے کسی ایک کے مطابق ہو اور اس کے کرنے سے کوئی خلاف شریعت کام لازم نہ آتا ہو اور بدعت سیئہ وہ ہے جو ان اصول کی صاف اور واضح مخالف ہو اور بحیثیت مجموعی یہ پانچ احکامات پر تقسیم ہے۔

لہذا بدعت کی بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ میں تقسیم اور ان کا بدعت سیئہ اور بدعت مذمومہ میں محدود ہونا جیسا کہ فقہا اور علمائے دین کی تحریروں میں آیا ہے۔ دونوں صحیح ہیں۔ یعنی یہ کہ بدعت کی تقسیم پہلے معنوں میں مراد ہے اور یہ کہ اس کا مفہوم دوسرے معنی میں منحصر ہے اور دونوں ہی معنی بدعت شرعی کے لیے مستعمل ہیں۔ یہی اصحاب شریعت کے یہاں معتمد اور علماء مذہب سے منقول ہے جیسا کہ گذشتہ سطور سے معلوم ہو گیا۔ پس حق ظاہر ہو گیا اور باطل

---

۱۵ - النہایۃ، ابن الجزری ۱۵۶ ج ۱ تحقیق طاہر احمد الزاوی، محمود محمد الطباحی (دار الفکر - بیروت: بلاسنہ)
۱۶ - فتاویٰ حدیثیہ شیخ ابن حجر مکی ۱۱۲، ۱۱۲، ۲۰۵ (مطبع جمالیہ مصر: ۱۳۲۸ھ)

غائب ہو گیا۔ اور علماء کے مختلف اقوال میں سے اختلاف دور ہو گیا' اور اس کی توفیق اللہ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ شانہٗ ہی زیادہ بہتر اور صحیح جاننے والا ہے۔

یہ تحریر بندہ مسکین محمد صدر الدین نے لکھی' اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ عفوو مغفرت کا معاملہ فرمائے۔ اور یہ خدمت صفر سہ ۱۲۶۶ھ (دسمبر ۱۸۴۹ء جنوری ۱۸۵۰ء) میں انجام پائی۔

قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ
مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى
يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ

حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کے قلم سے لکھے ہوئے قرآن شریف کا ایک صفحہ
(یہ قرآن شریف ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے)

حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانویؒ

سب سے پہلے پیر و مرشد (شاہ احسان علیؒ) سے استفادہ کی بعض تفصیلات اور تین غیر متعارف مکتوبات

نور الحسن راشد کاندھلوی

بارہویں صدی کے آخر یا شروع تیرھویں صدی ہجری کی بات ہے کہ ہندوستان کے مشائخ طریقت اور صوفیائے کرام کی شہرت اور ان کی بلند مقامی کا چرچا سن کر دو شخص، دو دوست، جن میں سے ایک افغانستان کے علاقہ روہ کے رہنے والے شاہ عبدالرحیم اور دوسرے ضلع ہزارہ صوبہ سرحد حال پاکستان کے باشندے اخوند جان محمد تھے عشق الٰہی کی آرزو اور معرفت و سلوک کی جستجو میں ایک ساتھ اپنے وطن سے نکلے اور دور دراز علاقوں میں مشائخ و اکابر کی زیارت وسیاحت کرتے، پھرتے پھراتے ایک ساتھ امروہہ پہونچے جہاں سلسلہ چشتیہ کی ایک نہایت معتقدر خانقاہ اہل نظر کی مرکز نگاہ تھی اور وہاں ایک عالی مرتبہ قوی النسبت شیخ (حضرت شاہ عبدالباری) تشریف فرما تھے اور طالبان خدا کی رہ نمائی و دستگیری فرمارہے تھے۔

یہ دونوں صاحبان ان کی خدمت میں پہونچے، حضرت شاہ عبدالباری نے شاہ عبدالرحیم کی ارادت و بیعت کو قبول فرمالیا اور جان محمد صاحب کو حکم ہوا کہ تمہارا حصہ ہمارے پاس نہیں ہے، تم شاہ غلام علی کے پاس جاؤ ان سے استفادہ کرو۔ اس وقت سے اگرچہ ان دونوں کے سیر سلوک اور دنیاوی سیر وسیاحت کے راستے اور منزلیں الگ الگ ہو گئی تھیں، حضرت شاہ عبدالرحیم پیر و مرشد کے آستانہ پر پڑے رہے اور اخواند جان محمد نے خانقاہ شاہ غلام علی کی چوکھٹ کو سینہ سے لگائے رکھا۔ دونوں نے سلوک بھی الگ الگ طریقوں سے طے کیا اور دونوں کے اجازت و ارشاد کے متعارف سلسلے بھی ایک دوسرے سے جدا تھے مگر دونوں کے ایک دوسرے سے گہرے مراسم۔ دلی محبت اور وہ ارتباط جو وطن سے روانگی کے وقت تھا زندگی کے آخر تک اسی طرح قائم واستوار رہا اور دونوں کے اخلاف نے

بھی اس کو اسی طرح قائم و برقرار رکھا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کی جسمانی اولاد کا ہمیں علم نہیں لیکن ان کے نامور خلیفہ اور قائم مقام حضرت میانجیو نور محمد نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور اخوندجان محمد کے فرزند عالی مقام مولانا شاہ عبدالعلیم لوہاروی ہوئے، اخوندجان محمد خانقاہ حضرت شاہ غلام علی کے ہمہ وقت خادم و حاضر باش اور وہاں کے عطیات و خم کدہ سے سیراب و سرمست رہتے تھے، اور مولانا عبدالعلیم یہاں لوہاری (مظفر نگر۔یو پی) میں مولانا محمد صادق لوہاروی سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس دوران حضرت میانجیو نور محمد بھی قرآن پاک کے معلم کی حیثیت سے لوہاری آگئے تھے، دونوں کو سیر سلوک کا شوق یکساں تھا اور دونوں کو بزرگوں اور مشائخ سے ملاقات و استفادہ کی دھن لگی ہوئی تھی اس لیے جس بزرگ کا پتہ چلتا اس بزرگ کے پاس جانے، اور جن صاحب کمال کی خبر ملتی ان کی زیارت سے مشرف ہوتے، دونوں کی اس ہم آہنگی نے بہت فائدہ پہونچایا اور دونوں اس پاک نیت کی وجہ سے راہ معرفت میں کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ایک دن دونوں کو یہ خبر ملی کہ جلال آباد میں (جو لوہاری سے تین کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے) ایک صاحب کمال درویش (شاہ احسان علی خلیفہ شاہ آبادانی) آئے ہوئے ہیں، اس خبر کے سنتے ہی دونوں حضرات ان بزرگ کی زیارت کے لیے مغرب کے بعد لوہاری سے چل کر جلال آباد پہونچے اس وقت شاہ احسان علی کا حلقہء ذکر و توجہ ہو رہا تھا۔دونوں صاحبان نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وہیں حاضر ہوگئے۔ مجلس اپنے شباب پر تھی اور اہل دل شاہ احسان علی کے قرب اور توجہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے، یہ دونوں حضرات وہیں بیٹھ گئے، اور جیسے ہی شاہ احسان علی کی نگاہ توجہ میانجیو پر پڑی، میونجیو بے حال ہو کر از خود رفتہ ہوگئے مگر شاہ عبدالعلیم پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ اسی طرح رہے جس طرح مجلس میں شامل ہوئے تھے میانجیو صاحب نے بعد میں شاہ احسان علی سے عرض کیا کہ ان کے حال پر بھی توجہ فرمائیے، فرمایا: ان کا دل تختہء زیر مشق کی طرح ہے (ابھی صاف ستھرا ہو کر تحریر کے لیے تیار نہیں ہوا اس لیے) میرے لائق نہیں ہے، اس کے بعد دونوں حضرات کا شاہ احسان علی کی خدمت میں

حاضری کا معمول رہا۔ اسی دوران حضرت میانجیو نور محمد شاہ احسان علی سے بیعت بھی ہو گئے میانجیو کا استفادہ کا سلسلہ اور سیر سلوک جاری تھی کہ شاہ احسان علی صاحب حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی کے طلب فرمانے پر لوہاری اور جلال آباد سے رخصت ہو کر سہارنپور چلے گئے (جہاں اس وقت مفتی صاحب قیام پذیر تھے)

اس وقت سے حضرت میانجیو کے شاہ عبدالعلیم لوہاروی سے ہمیشہ روابط رہے اور اسی نسبت سے حضرت شاہ عبدالعلیم کے خاص مسترشد اور خلیفہ خاص مولانا نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی سے بھی بہت قریبی اور نہایت مخلصانہ تعلقات رہے۔ اس کی جو تفصیل خود مولانا نصراللہ خاں خویشگی نے لکھی ہے اس سے یہ صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ حضرت میانجیو، مولانا خویشگی کو دوستوں کی طرح سمجھتے تھے سب معاملات میں ان سے تذکرہ و مشورہ فرماتے رہتے تھے۔ ارشاد و سلوک کے اسرار و رموز ہوں اپنے خاص متوسلین کی تربیت اور اجازت و خلافت کی بات ہو، یا گھریلو قصے، ہر اک معاملہ میں مولانا خویشگی حضرت میانجیو کے معتمد اور راز دار معلوم ہوتے ہیں۔ ان تعلقات و مراسم کی روداد مولانا خویشگی نے بیاض دلکشا میں درج کی ہے۔ اس میں حضرت میانجیو صاحب کے وہ خطوط بھی شامل کیے ہیں جو میانجیو نے مولانا خویشگی کو لکھے، مولانا خویشگی کی ان اطلاعات سے حضرت میانجیو سے متعلق معلومات کا ایک نیا باب کھلتا ہے اور میانجیو کے سیر سلوک کے سلسلہ میں ایسی چیزوں کا علم ہوتا ہے جن کا دوسرے مآخذ میں نام و نشان تک نہیں اور بظاہر حضرت میانجیو کے بعض خاص متوسلین کرام بھی ان سے ناآشنا تھے، اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ بے تکلف احباب اور مسترشدین و معتقدین کی معلومات و تعلقات کا دائرہ الگ الگ ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی معلومات اور نقطۂ نظر سے بہر حال متفق ہوں، لیکن اگر معاصرین خصوصاً بے تکلف احباب اپنے کسی دوست کو قریب سے دیکھ کر یا برت کر اس کے تعلق مع اللہ بزرگی اور علوئے مرتبت کے قائل ہوں تو یہ اعتراف مریدین و مخلصین کے اعتراف سے کہیں زیادہ وقیع اور لائق توجہ ہوتا ہے۔ حضرت میانجیو نور محمد کے متعلق، مولانا نصر اللہ خان کے اعتراف میں یہی پہلو نمایاں ہے اس

لیے اس کی یقیناً بہت اہمیت ہے، ایک اور وجہ سے بھی اس کی اہمیت ہے کہ مولانا نصر اللہ خاں خویشگی کی تحریرات سے پہلی مرتبہ حضرت میانجیو نور محمد کے سفر معرفت کی ابتدا اور اس کے محرکات کا معتبر ذریعہ سے علم ہوتا ہے۔ بہر حال یہاں مولانا خویشگی کی فراہم کی ہوئی جملہ معلومات اور ان کے نام حضرت میانجیو صاحب کے مکتوبات گرامی درج کیے جارہے ہیں، مکتوبات کے مطالعہ سے پہلے حضرت میانجیو اور مولانا نصر اللہ خاں خویشگی کے احوال و سوانح کا خلاصہ درج کرنا ضروری ہے۔

ولادت جھنجھانہ جو ضلع مظفر نگر کی ایک بہت پرانی اور کئی حیثیتوں سے تاریخی اور ممتاز بستی ہے حضرت شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی (وفات ۹۴۹ھ) کی اولاد میں ایک باخدا شخص جمال محمد (بن پیر محمد بن محمد رضا بن الٰہی بخش)۔ (۱) کے گھر میں ۱۲۰۱ھ میں ایک فرزند تولد ہوا، جس کا نام نور محمد رکھا گیا، "ماہ درخشاں" کے اعداد سے سنہ ولادت معلوم ہوتا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی تحریر فرماتے ہیں:

سال تاریخ تولد اور وفات
ان کی دونوں مجھ سے سن اے نیک ذات
جب ہوا پیدا وہ نور معرفت
شبلیٔ دوران ادھم کی صفت
ہجرت نبوی کا اے فرخندہ فال
بارہ سو پر تھا زیادہ ایک سال
بارہ سو انسٹھ میں کر کے انتقال
اس جہاں سے جاملے باذوالجلال (۲)

۱۔ میونجیو کے خاندان اور اجداد و اولاد وغیرہ کی تفصیل کے لیے رجوع فرمایئے:
نور محمدی مرتبہ نسیم احمد علوی جھنجھانوی (جھنجھانہ: ۱۹۵۶ء) صحیفہ ابرار طبع اول (جھنجھانہ: ۱۹۷۲)
نیز سوانح حضرت میانجیو نور محمد، مرتبہ نسیم احمد جھنجھانوی ص ۳۵-۴۰ (جھنجھانہ - ۱۹۸۵ء)
۲۔ غذائے روح، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی ص ۵ (مشمولہ کلیات امدادیہ ص ۱۳۷)
(فخر المطابع لکھنؤ: ۱۳۲۲ھ)

یہ فرزند ایسا مبارک اور اسم بامسمی ثابت ہوا کہ اس کے ذریعہ سے نہ صرف یہ خاندان منور و روشن ہوا بلکہ ہندوستان میں سلوک کے سلسلوں اور روحانیت و معرفت کے چراغوں میں نئی تازگی، نئی روشنی اور نئی کیفیت پیدا ہو گئی۔

حضرت میانجیو نور محمد کی ابتدائی عمر کس ترتیب سے گذری، کہاں کن اساتذہ سے کیا کیا تعلیم پائی اس کی تفصیل دریافت نہیں (۲)۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ریاست کنج پورہ (ضلع کرنال) سے تعلیم یا ملازمت کا رشتہ استوار ہوا، کچھ دن وہاں قیام فرمایا بعد میں موضع لوہاروی (نزد جلال آباد و تھانہ بھون ضلع مظفر نگر) کے ایک ممتاز عالم مولانا محمد صادق لوہاری (۳) کی فرمائش و طلب پر لوہاری تشریف لے آئے تھے۔

۲۔ مرقومات امدادیہ کے مقدمہ (پروفیسر نثار احمد صاحب فاروقی) میں حضرت میانجیو کی تعلیم کے سلسلہ میں امیر الروایات (ارواح ثلاثہ) کی وہ دو روایتیں غالباً سہواً نقل ہو گئی ہیں جو حضرت سید احمد شہید کی تعلیم سے متعلق ہیں، ملاحظہ ہو: مقدمہ میں مرقومات امدادیہ ص ۲۱ (دہلی ۱۳۹۹ھ - ۱۹۸۹ء) اگرچہ فاضل مقدمہ نگار نے امداد المشتاق (دہلی: ۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء) کے مقدمہ مرقومات امدادیہ کی چند فروگذاشتوں کی تصحیح و وضاحت کر دی ہے مگر اس فرو گذاشت پر غالباً اس وقت نظر نہیں گئی۔ بہر حال یہ اطلاع درست نہیں مقدمہ مرقومات امدادیہ میں درج دونوں روایتں حضرت سید احمد شہید سے متعلق ہیں میانجیو نور محمد سے ان کا کچھ تعلق نہیں نیز حضرت میانجیو صاحب کے شاہ عبدالعزیز یا ان کے برادران گرامی سے تعلیم پانے کی روایات بھی صحیح نہیں ہیں۔

۳۔ مولانا محمد صادق، لوہاری کے باشندے تھے حضرت مفتی الٰہی بخش سے تعلیم حاصل کی اور اپنے عہد کے ممتاز علماء میں شمار کیے گئے تمام عمر درس و افادہ کا سلسلہ جاری رہا، متعدد بڑے اور اس علاقہ کے برگزیدہ علماء کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، تلامذہ میں نصر اللہ خاں خویشگی کے پیرومرشد مولانا عبدالعلیم بھی شامل ہیں نصر اللہ خاں خویشگی نے مولانا محمد صادق کو قدوۃ العلماء مولانا محمد صادق کے نام سے ذکر کیا ہے، مولانا محمد صادق کی ہدایت پر حضرت میانجیو لوہاری تشریف لائے تھے افسوس ہے کہ مولانا کے تفصیلی حالات اور سنہ ولادت و وفات معلوم نہیں۔

مولانا محمد صادق لوہاروی کے حوالہ سے حضرت حاجی امداد اللہ نے بعض روایات نقل فرمائی ہیں۔ ملاحظہ ہو شمائم امدادیہ ص ۱۶۴، ۱۸۰ (لکھنو: ۱۳۱۴ھ)

جس مسجد میں حضرت میانجیو کا قیام تھا وہ مولانا محمد صادق کی مسجد کہلاتی تھی، اسی مسجد سے مولانا صادق کے درس وافادہ کا سلسلہ جاری تھا۔

ملازمت لوہاری: لوہاری میں ملازمت کب شروع ہوئی اس کی بھی تاریخ اور سنہ حتمی طور پر معلوم نہیں لیکن مولانا شیخ محمد تھانوی کی ایک تحریر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تقریباً بائیس تیئیس سال کی عمر میں یعنی ۲۳-۱۲۲۲ھ (۸-۱۸۰۷ء) میں لوہاری آگئے تھے، مولانا شیخ محمد تھانوی نے لکھا ہے:

"در آنجا (یعنی در لوہاری) حضرت سی و شش سال بلکہ زائد ازاں تشریف داشتند" (۵)

حضرت میانجیو صاحب کی وفات رمضان المبارک یا شوال سنہ ۱۲۵۹ھ (اکتوبر، نومبر ۱۸۴۳ء) میں ہوئی اگر اس میں سے چھتیس ۳۶ سال کم کر دیے جائیں تو بارہ سو تئیس (۱۲۲۳ھ) باقی رہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ انہی سنین میں لوہاری تشریف آوری ہوئی تھی۔ اس وقت سے آخر زمانہ حیات تک (ایک درمیانی وقفہ کے علاوہ) مسلسل لوہاری میں قیام فرما رہے۔ درمیان میں کسی وجہ سے اہل لوہاری سے کبیدہ خاطر ہو کر جھنجھانہ آگئے تھے مگر جلد ہی اہل لوہاری کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، وہ لوگ میانجیو کو واپس لوہاری لے آئے تھے۔ (۶)

میانجیو صاحب کا لوہاری میں قیام اگرچہ ایک ملازم اور معلم کی حیثیت سے تھا جس کی طرف حضرت حاجی امداد اللہ نے بھی ایک مکتوب میں اشارہ فرمایا ہے، (حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے نام) تحریر فرماتے ہیں:

"نوکری مطبع خوب نمی پندارم کہ از صبح تا شام ہمہ تن مصروفیت بوے باشد، اگر نوکری معلمی بود چہ خوش است، اول سنت سیدی و شیخی قدس سرہ است (۷)۔

میں پریس کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں صبح سے شام تک اسی کی مصروفیت رہتی ہے۔ اگر پڑھانے کی ملازمت ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا پہلے تو وہ میرے شیخ اور سردار (حضرت میانجیو نور محمد) کا طریقہ ہے

۵۔ انوار محمدی ص ۴۲ مولانا شیخ محمد تھانوی (مطبع ضیائی میرٹھ: ۱۲۹۱ھ)
۶۔ نور محمدی ص ۵۸ (جھنجھانہ: ۱۹۵۶ء)
۷۔ مرقومات امدادیہ ص ۱۴ مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (دہلی: ۱۳۹۹ھ)

مگر اس قیام و مقام سے حضرت میانجیو صاحب کو غیر معمولی منافع و فوائد حاصل ہوئے ہیں اول اول معرفت کی چاشنی پیدا ہوئی، یہیں سب سے پہلے پیر و مرشد حضرت شاہ احسان علی پٹنی کی زیارت ہوئی، یہیں ان سے بیعت ہوئے اور روحانی تربیت و استفادہ کا موقع ملا، یہیں کے قیام میں حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی سے وابستگی نصیب ہوئی اور یہیں حضرت سید احمد شہید کا دامن تھاما اور اجازت و خلافت حاصل کی، اس سلسلہ کی ابتداء حضرت شاہ احسان علی پٹنی سے ملاقات، تاثر و عقیدت اور بعد میں بیعت و استفادہ کے ذریعہ ہوئی۔

سب سے پہلا سلسلہ، ارشاد و تربیت : حضرت مجدد الف ثانی کے برگزیدہ خلفا میں حضرت سید آدم بنوری کا نام نامی سرفہرست ہے، ان کے میخانۂ معرفت سے ہزارہا افراد مستفید و فیضیاب ہوئے جس میں متعدد ایسے ہیں جنھوں نے بعد میں برصغیر کی دینی علمی تاریخ میں بلند مقام پایا اور ان کے ذریعہ اصلاح و معرفت کا بڑا کام ہوا، متاخر دور میں اسی سلسلہ کے ایک ممتاز مرشد حضرت شاہ آبادانی سیالکوٹی تھے۔ شاہ آبادانی سیالکوٹی حضرت سید آدم کے سلسلہ میں میر محمد زکریا سے وابستہ اور مجاز بیعت تھے، ان کا سلسلہ سلوک اس طرح ہے:

"صوفی شاہ آبادانی سیالکوٹی، از میر محمد زکریا، از پیر محمد سندھی، از شاہ محمد قریشی لاہوری، از شاہ محمد خاں لودھی، از پیر محمد خاں لودھی، از حضرت سید آدم بنوری۔ از حضرت مجدد الف ثانی احمد سرہندی، از حضرت شیخ سکندر کیتھلی۔ (۸)"

شاہ آبادانی اپنے وطن میں قیام فرما، صاحب جہد و ریاضت اور صاحب کمال بزرگ تھے مرہٹوں کی شورش میں ترک وطن کر کے دلی آگئے تھے دہلی میں قیام کیا اور ذریعہ معاش کے لیے کاغذ بنانے اور فروخت کرنے کا سلسلہ شروع کیا مگر:

۸۔ در فرید، تالیف مولوی فرید احمد غازی پوری خلیفہ مولانا نصر اللہ خاں خویشگی ص ۷۷-۷۶ (مطبع دار العلوم میرٹھ: 　　) نیز مقدمہ امداد المشتاق مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی ص ۶۱ (دہلی: ۱۴۰۱ھ)

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

شاہ صاحب کے کمال معرفت اور صفائی باطن کا چرچا ہو گیا اور کثرت سے اہل طلب ان سے رجوع اور بیعت ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو حسد ہوا اور شاہ صاحب کے خلاف سازشیں شروع کی گئیں مگر شاہ آبادانی بدستور اپنے کام میں مشغول رہے (۹)

شاہ آبادانی کی ۱۸ ربیع الاول ۱۲۲۰ھ (۱۶ جولائی ۱۸۰۵ء) کو دہلی میں وفات ہوئی (۱۰)، اپنی خانقاہ میں دفن کئے گئے۔ مگر ڈاکٹر صابر علی خاں نے مجموعۂ رنگین کا جو تعارف مرتب کیا ہے اس میں شاہ آبادانی کا سنہ وفات ۱۲۲۹ لکھا ہے (۱۱) جو بظاہر سہو کتابت ہے۔

اس خانقاہ کا محل وقوع شاہ آبادانی کی خانقاہ اور مزار کے محل وقوع میں ایک مشتبہ (۱۲) لفظ، اور علامہ اخلاق حسین دہلوی کی ایک اطلاع (۱۳) کی وجہ سے غلط فہمی

۹۔ شاہ آبادانی کے ایک مسترشد اور خلیفہ امجد علی خاں نے شاہ صاحب کے احوال و ملفوظات پر ایک جامع کتاب نور القلوب کے نام سے مرتب کی ہے، نور القلوب کے متعدد نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ایک نہایت خوشخط عمدہ نسخہ پروفیسر نثار احمد فاروقی (امروہہ، دہلی) کے ذاتی ذخیرہ میں موجود ہے، راقم سطور کو اس سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔

۱۰۔ مقدمہ امداد المشتاق میں یہ تاریخ ۱۳ ربیع الثانی درج ہو گئی ہے ص ۱۶ جو دیگر ماخذ کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتی۔

۱۱۔ سعادت یار خاں رنگین، ۲۵۰ (کراچی : ۱۹۵۶ء)

۱۲۔ یہ مشتبہ لفظ پن چکیاں ہے محققین نے اس کو پنچ کوئیاں پڑھا، جس کی وجہ سے سخت مغالطہ ہوا پن چکیاں، لال قلعہ کے قریب تھیں اور پنچ کوئیاں روڈ اس سے بہت دور الگ علاقہ میں واقع ہے۔

۱۳۔ علامہ اخلاق حسین نے اپنا مشاہدہ کئی موقعوں پر نقل کیا ہے اور یہی پروفیسر محمد اسلم صاحب کو بھی لکھا تھا۔ پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں :

"وہ (طہماس خاں) اور اس کے فرزندان گرامی پنچ کوئیاں روڈ پر شاہ آبادانی کی خانقاہ میں دفن ہوئے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اس خانقاہ کو بڑا نقصان پہونچا۔ (ملاحظہ اگلے صفحے پر)

ہو گئی ہے، اس لیے اس کے صحیح مقام کی نشاندھی ضروری ہے، یہ خانقاہ اور متعلقہ مزارات لال قلعہ اور جامع مسجد (دہلی) کے سامنے سے گزر کر پرانی دلی ریلوے اسٹیشن اور کشمیری دروازہ جانے والی سڑک کے اس مغربی کونہ میں واقع تھے جہاں آج کل Presentation Convent Senior Secondary School Delhi - 6. کی عمارتیں ہیں۔ یہ خانقاہ اور مزارات سن ۱۸۵۷ء تک موجود تھے، ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے موقع پر مولانا نصر اللہ خاں خویشگی اپنی ملازمت سے یکسو ہو کر گڑ گاؤں سے دھلی آ گئے تھے اور اسی خانقاہ میں مقیم رہے۔ مگر جب مولوی احمد علی خیر آبادی نے قصر عارفاں لکھی تو یہ خانقاہ زمین کے برابر ہو چکی تھی۔ صرف شاہ آبادانی کا مزار موجود تھا (۱۳ب) بظاہر جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب انگریزوں نے لال قلعہ اور جامع مسجد دھلی درمیان کی سب عمارتیں اور مکانات مسمار کئے تو یہ خانقاہ اور قبرستان بھی عتاب کی زد میں آئے اور منہدم کر دیے گئے۔ بہر حال اس کا صحیح محل وقوع مولوی سید احمد ولی اللہی کی تحریر سے معلوم ہو رہا ہے، وہ لکھتے ہیں۔ (۱۴):

شاہ آبادانی کی قبر مبارک کے علاوہ باقی تمام قبریں صاف کر (دی) گئیں، علامہ اخلاق حسین دہلوی نے آزادی سے قبل یہ جگہ دیکھی تھی۔ ایک سپاٹ میدان میں ایک پختہ قبر موجود تھی اور اس کے قریب تالاب میں دھوبی کپڑے دھویا کرتے تھے، ان دھوبیوں نے بھی تصدیق کی تھی کہ یہ قبر شاہ آوادنی کی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ یادگار بھی مٹ گئی اور وہاں جدید طرز کے بنگلے تعمیر ہو گئے، اور اب اس خانقاہ کے محل وقوع کا پتہ چلانا مشکل ہے"

(مضمون طہماس بیگ خاں، پروفیسر محمد اسلم، مشمولہ پنجاب یونیورسٹی ہسٹریکل سوسائٹی جرنل، لاہور۔ جلد نمبر ۲۳۔ شمارہ ۳۰، ۱۹۸۶ء)

۱۳ب۔ قصر عارفان، فارسی احمد علی خیر آبادی (مولفہ ۱۲۸۱ھ) مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر ص ۲۲۶ (لاہور: ۱۹۶۵ء مابعد)

۱۴۔ یادگار دھلی، سید احمد ولی اللہی ص ۷۰ (دہلی: ۱۹۰۱ء)

"دروازہ سے نکل کر ایک راستہ قلعہ کے پاس شمالی جانب میں دروازہ کو جاتا ہے۔ دوسری سڑک خندق سے ملی ہوئی جنوبی دروازہ کی طرف آتی ہے تیسری بیچ کی سیدھی سڑک چاندنی چوک کو جاتی ہے۔ ادھر ٹھنڈی سڑک اس کو کاٹتی ہوئی پن چکیوں ہوتی ہوئی کشمیری دروازہ نکل جاتی ہے اب تم ٹھنڈی سڑک کو پن چکیوں کی طرف چلو۔ اس چوراہے سے تقریباً تین سو پچھتر قدم کے فاصلے پر نہر کا پل آتا ہے۔ اس کے مشرقی جانب نہر کے اوپر پن چکیاں ہیں، اسی نہر سے چلتی ہیں جو تمام شہر اور قلعہ میں آتی ہے اور دلی کی طرح، ہر موقع پر نئے نام سے موسوم ہوتی رہتی ہے کہیں چاندنی چوک کی نہر کہلاتی ہے، کہیں سعادت خاں کی نہر بن جاتی ہے۔ پن چکیوں کے سامنے میدان میں جانب غرب، نہر کے شمالی کنارہ پر شاہ آبادانی کا مزار ہے۔"

بعد کے چند سال میں جو تغیرات ہوئے ان کا احوال مولوی بشیر الدین احمد (۱۵) نے قلم بند کیا ہے مشاہیر دہلی پر اور مآخذ سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے (۱۶)۔

اس خانقاہ کی پوری عمارت اور متعلقہ قبرستان سب اسی احاطہ میں واقع تھا اور اب سب بے نام و نشان ہو چکے ہیں سدا نام رہے اللہ کا۔

شاہ آبادانی کے متعدد قابل قدر خلفاء تھے جس میں سعادت یار خاں رنگین کے برادر بزرگ شاہ صوفی آبادانی علوئے مرتبہ اور علمی عملی کمالات میں سرفہرست تھے اور یہی شاہ آبادانی کے جانشین اور خانقاہ آبادانیہ کے سجادہ تھے، دوسرے خلفاء میں نواب امجد علی خاں (مولف نور القلوب) اور شاہ احسان پٹنی قابل ذکر ہیں۔

شاہ احسان علی پٹنی شاہ احسان علی ------- حضرت بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں اور پاک پٹن کے رہنے والے تھے ان کے والد کا موضع پنڈی بابا صاحب

۱۵۔ واقعات دار الحکومت دہلی، مولوی بشیر الدین احمد ص ۲۲۵ جلد دوم (طبع اول آگرہ: ۱۹۱۹ء)

۱۶۔ مزارات اولیائے دہلی محمد عالم شاہ فریدی ص ۱۲۵ طبع دوم (دہلی: ۱۳۴۶ھ) نیز تاریخ اولیائے صوبہ دہلی، رکن الدین نظامی ص ۲۰۵ مولفہ سنہ ۱۳۵۴ھ (دہلی: بلاسنہ) ۱۷۔ بیاض دلکشا ص ۴۔

میں قیام تھا اور دادا موضع گھاسی والا میں مقیم تھے، شاہ احسان علی نے اپنے چچا سے قرآن شریف پڑھا قرآت میں پوری مہارت حاصل کی، آواز قدرتی طور پر نہایت خوبصورت و دلکش تھی، قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد دہلی گئے۔ سفر کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ذریعہ معاش حاصل ہو یا کسی ذریعہ سے کوئی جاگیر یا اراضی مل جائے، اس کام کے لیے دہلی میں جہاں تک ہوا لوگوں سے ملے اور کوشش کی، یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ آبادانی دہلی میں قیام فرما تھے اور ان کے فیوض کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی تھی، کسی شخص نے مشورہ دیا کہ جاکر شاہ آبادانی سے ملو، ممکن ہے ان کے ذریعہ سے کسی جاگیر یا وظیفہ کا انتظام ہو جائے اس تقریب سے حضرت آبادانی کی خدمت میں جانا ہوا (۱۷) وہاں پہونچ کر وظیفہ اور جاگیر کی بات تو رہ گئی جس کی تلاش تھی، روحانی صحائف اور معرفت کی ایسی وسیع جاگیر حاصل ہو گئی جس کے انوار بہت دیر تک چمکتے رہے۔

پہلی ملاقات میں شاہ آبادانی سے متاثر اور ان کے عقیدت مند ہو گئے۔ فوراً ہی بیعت کی درخواست کی جو بعد میں قبول کر لی گئی۔ کچھ دن سیر سلوک میں مشغول رہے بعد ازاں وطن واپس چلے گئے، تقریباً ڈھائی سال بعد پھر شیخ کی خدمت میں واپس آئے اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ اس دوران حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور چند دن کے بعد شاہ آبادانی نے سفر سلوک و معرفت مکمل کرا کر اجازت بیعت سے ممنون و مشرف فرمایا (۱۸)۔

سید امجد علی لکھنوی نے (جو شاہ آبادانی کے ایک ممتاز خلیفہ اور شاہ آبادانی کے مجموعہ احوال و ملفوظات، نورالقلوب کے مرتب و جامع ہیں) لکھا ہے کہ اگرچہ شاہ احسان علی کو حضرت شاہ آبادانی سے اجازت تھی مگر انھوں نے (پیرو مرشد کی ہدایت کے مطابق) سلوک کی تکمیل شاہ آبادانی کے خلیفہ اول اور جانشین صوفی اللہ یار خاں سے کی اور سلسلہ نقش بندیہ میں صوفی اللہ یار خاں سے اجازت پائی۔ مگر

۱۷۔ بیاض دلکشا ص ۴۔
۱۸۔ بیاض دلکشا ص ۸۔

نصر اللہ خان خویشگی نے اس کی صاف تردید کی ہے کہ شاہ احسان علی نے صوفی اللہ یار سے استفادہ کیا تھا اور وہ ان کے مجاز بیعت تھے، اس کی تائید میں خود شاہ آبادانی کا مقولہ نقل کیا ہے کہ:

"شمارا محتاج کسے نہ گذاشتہ ام" (۱۹)

اجازت ملنے کے بعد شیخ سے رخصت ہو کر نجیب آباد پہونچے اور اپنا ساز و سامان غرباء میں تقسیم کر کے پہاڑ کی کھو میں رہنے لگے۔ کچھ دن بعد وہاں سے امروہہ کے لیے روانہ ہوئے، امروہہ والوں نے مولانا سے استفادہ کیا اور متعدد اصحاب مولانا سے بیعت ہوئے (۲۰)

شاہ احسان علی امروہہ سے کوٹہ (راجستھان) گئے وہاں سے حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کی خواہش پر ٹونک کا سفر کیا (۲۱) اس وقت حضرت سید صاحب نواب امیر خاں والی ٹونک کی سرکار میں زمرۂ سواران میں ملازم تھے، شاہ احسان علی بھی غالباً اسی سلسلہ سے منسلک ہوئے اور ان کے خرچہ کے لیے بارہ آنہ روزانہ دیئے جانے کا حکم ہوا۔ شاہ احسان علی ٹونک کب گئے؟ اس کی صحیح تاریخ کا علم نہیں مگر قیاساً یہ واقعہ ۱۲۲۷ھ (۲۲) میں سید صاحب کے امیر خاں کے لشکر میں شامل ہونے کے قریبی دور کا ہے کیونکہ ٹونک سے واپس آنے اور متعدد مقامات کا سفر کرنے کے بعد احسان علی جلال آباد پہونچے تھے، جلال آباد سے حضرت مفتی الٰہی بخش نے ان کو سہارنپور طلب فرمالیا تھا مولانا نصر اللہ خاں خویشگی لکھتے ہیں:

"بعد قیام چند روز جناب فیض مآب قدوۃ المحدثین، زبدۃ المحققین جناب مولانا مفتی الٰہی بخش رضی اللہ عنہ متوطن کاندھلہ ایشاں را در سہارنپور طلب فرمودند زیرا کہ مفتی صاحب مرحوم در آنجا بسر کار امیر الامراء نواب

۱۹۔ بیاض دلکشا ص ۸۔
۲۰۔ بیاض دلکشا ص ۱۰، ۹۔
۲۱۔ بیاض دلکشا ص ۱۶۔
۲۲۔ سیرت سید احمد شہید، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۲۷۔۱۲۸ ج ۱ (لکھنؤ: ۱۳۹۷)

احمد خاں صاحب بھڑیچ مدرس بودہ اند، و بتعلیم خلائق مشغول و مصروف حضرت صاحب حسب طلب مفتی صاحب مغفور از جلال آباد کوچیدہ بسہارنپور تشریف بردند، ودر قلعہ نزد مفتی صاحب مبرور فرود آمدند و بہ ہدایت (خلق) مشغول شدند (۲۳)۔

ترجمہ :۔ چند دن ٹھہرنے کے بعد محدثین کے سردار، محقق یگانہ جناب مولانا مفتی الٰہی بخش متوطن کاندھلہ نے ان کو سہارنپور طلب فرما لیا، کیوں کہ (اس وقت) مفتی صاحب امیر الامراء نواب احمد خاں بھڑیچ کی سرکار میں مدرس اور مخلوق کی تعلیم و تربیت میں مشغول تھے، حضرت (شاہ احسان علی) صاحب کی ہدایت کے مطابق جلال آباد سے روانہ ہو کر، سہارنپور تشریف لے گئے، قلعہ (نوابان) میں مفتی صاحب کے پاس اترے اور اصلاح و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔

اور حضرت مفتی الٰہی بخش کا سہارنپور کا قیام (اس وقت تک دریافت معلومات کے مطابق) تقریباً ۱۲۲۸ھ میں ختم ہو گیا تھا (۲۴)۔ بہر حال شاہ احسان علی مفتی صاحب کے حسب ہدایت سہارنپور آ گئے وہاں قیام پذیر رہے پھر آگے سفر پر نکل گئے۔ مختلف مقامات پر ٹھہرتے، قیام کرتے، آخر میں انبالہ پہنچے۔ انبالہ کے زمانہ قیام میں اچانک بیمار ہوئے اور معمولی علالت کے بعد وہیں رحلت کر گئے، محلہ نور بافان کی مسجد میں قیام تھا وہیں دفن کیے گئے (۲۵)۔

سنہ وفات: شاہ احسان علی کی تاریخ وفات کا علم نہیں۔ نصر اللہ خاں خویشگی نے ان کے اسفار، سیر و سیاحت، انبالہ آنے، مرض وفات، تدفین سب کا ذکر کیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تاریخ وفات نہیں لکھی، دوسرے موقعوں پر اس حادثہ وفات کے قریب کے جو واقعات نقل کئے گئے ہیں ان سے بھی کوئی صاف

۲۳۔ بیاض دلکشا ص ۲۶۔

۲۴۔ مضمون راقم سطور بر حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، احوال و آثار، شمارہ اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۴ء ۴۱۔

۲۵۔ بیاض دلکشا ۴۷۔۴۶۔

بات معلوم نہیں ہوتی قیاساً یہ واقعہ سنہ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) کے آخری چھ مہینوں کا ہے۔

شاہ احسان علی بڑے قوی التاثیر اور صاحب زہد و ریاضت بزرگ تھے وسیع حلقہء مریدین و مسترشدین تھا، اور اس نواح کے اکابر علماء اور مشائخ کی نظر میں ان کی خاص قدر و منزلت تھی، حضرت مفتی الہی بخش نے مرجع خلائق عالم و مفتی اور بلند پایہ شیخ طریقت ہونے کے باوصف اپنے قریب ترین عزیزوں، شاگردوں، بھتیجے مولانا حکیم محمد اشرف، بھانجے مولانا حافظ مصطفی جھنجھانوی، وحافظ محمد صابر جھنجھانوی (رفیق جہاد سید احمد شہید) نیز مولانا محمد حسن رام پوری کو شاہ احسان بیعت کرایا (۲۶ الف) ان میں سے حافظ مصطفی کو شاہ احسان علی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ (۲۶ ب)۔

میانجیو نور محمد کی شاہ احسان علی سے ارادت اور بیعت شاہ احسان علی کا جلال آباد، لوہاری وغیرہ آنا جانا رہتا تھا، نصر اللہ خاں خویشگی نے تو اس کی وجہ نہیں لکھی، مگر بظاہر یہ آمد و رفت شاہ احسان علی کے برادر طریقت اور شاہ آبادانی کے کے خلیفہ، اور صوفی اللہ یار خاں سے ملاقات کے لیے ہوتی ہو گی جو ضابطہ خاں کی سرکار میں ملازم تھے اور لوہاری میں رہتے تھے۔ حضرت میانجیو نور محمد کی شاہ عبدالعلیم سے دوستی اور رفاقت تھی مختلف معاملات میں ایک دوسرے کے رفیق و مشیر تھے، مشائخ و صوفیا اور اسرار طریقت کا بھی باہم تذکرہ رہتا تھا، ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ جلال آباد میں ایک بڑے صاحب کمال اور صاحب احوال شیخ (شاہ احسان علی) آئے ہوئے ہیں او مغرب کے بعد ان کا حلقہء ذکر و توجہ منعقد ہوتا ہے، یہ دونوں صاحبان مغرب کی نماز کے بعد جلال آباد کے لیے روانہ ہوئے اور جلد ہی جلال آباد پہنچے اور شاہ احسان علی کے حلقہ میں بیٹھ گئے، شاہ صاحب کی نگاہ حضرت میانجیو صاحب پر پڑی اور میانجیو صاحب بے خود و بے اختیار ہو گئے۔ بہت دیر کے بعد اس کیفیت سے افاقہ ہوا، چونکہ شاہ عبدالعلیم پر اس ملاقات و مجلس کا کوئی اثر

---

۲۶ الف۔ بیاض دلکشا ۲۶۔

۲۶ ب۔ بیاض دلکشا ۶۲، ۶۱۔

نہیں ہوا تھا، اس لیے میانجیو صاحب نے ان کی سفارش کی اور شاہ احسان علی سے عرض کیا کہ:

"این ہم طریق بندہ نہایت مرد بزرگ و طالب نام خدائے عم نوالہ است و اکثر اشغال و اذکار میداند، و درخدمت اکثر بزرگان حاضر بودہ است خصوصا بخدمت حضرت قدوۃ الشیوخ شاہ غلام علی صاحب عرصہ بست سال است کہ مستفید و مستفیض است ----" (۲۷)

ترجمہ: یہ بھی راہ طریقت میں بندہ کے ساتھ ہیں، نہایت نیک شخص اور حق تعالیٰ شانہ کے نام کے طلب گار ہیں اور راہ سلوک کے اکثر شغل اور اذکار جانتے ہیں اکثر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، خصوصاً حضرت شاہ غلام علی کی خدمت میں عرصہ بیس سال سے مستفید ہیں۔

شاہ احسان علی صاحب نے فرمایا:

"قلب ایشاں چوں تختہ زیر مشق است لائق مانیست، زیرا کہ ما جملہ نقوش نگاشتہ را بشویم باہماں نقوش را حسب مرضی خود درست کنم، و ایں ہر دو فعل مشقت طلب اند" (۲۸)

ترجمہ: ان کا دل زیر مشق (بچوں کی) تختی کی طرح ہے میرے لائق نہیں ہے کہ میں لکھے ہوئے سب حروف کو دھو ڈالوں اور پھر ان حروف کو اپنی مرضی کے مطابق لکھوں۔ یہ دونوں کام مشقت طلب ہیں۔

اس گفتگو سے شاہ عبدالعلیم کو طبعی طور پر افسوس ہوا کہ میں بیس سال سے شاہ غلام علی کی صحبت سے فیضیاب ہوں اور اس قدر ریاضت و مجاہدات کیے ہیں میرا حال شاہ احسان علی کی ایک توجہ کے لائق بھی نہیں ہے، بہر حال اس محفل سے فارغ ہو کر دونوں صاحبان راستہ میں شاہ احسان علی کے مرتبہ کمال اور اس

۲۷۔ بیاض دلکشا ص ۲۵۔
۲۸۔ بیاض دلکشا ص ۲۵۔

مشاہدہ کا ذکر و تذکرہ کرتے ہوئے اپنی قیام گاہ لوہاری واپس آگئے۔

شاہ احسان علی کے اس ارشاد سے حضرت میانجیو نور محمد کے عالی جوہر رفعت پرواز اور اعلی درجہ کی صفائی باطن اور پاکیزگی قلب کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب پیر و مرشد کی خدمت میں پہلی حاضری کے وقت ان کی اندرونی کیفیت کا یہ حال تھا کہ اس کے سامنے بڑے مشائخ کی بیس بیس سالہ صحبت سے مستفید اور صاحب ریاضت و مجاہدہ اصحاب کی کوئی حیثیت نہیں تھی تو بعد میں جب مشائخ سے متواتر استفادہ اور ان کی خدمت میں مسلسل حاضری اور اصلاح و تربیت کا معمول رہا ہوگا اس وقت اس کیفیت میں کس قدر شبانہ روز اضافہ ہوا ہوگا؟۔

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود　　　این ز اخلاصات ابراہیم بود

اس وقت شاہ احسان کی خدمت میں حاضری' ان سے مستقل ارادت و اصلاح کی بنیاد بنی بعد میں بھی میانجیو صاحب اور مولانا عبدالعلیم دونوں پابندی سے شاہ احسان علی کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے' میانجیو صاحب شاہ احسان علی سے بیعت ہوگئے' تربیت باطن کا سلسلہ شروع ہوا اور استفادہ جاری رہا ابھی شاہ احسان علی سے اجازت نہیں ملی تھی کہ شاہ احسان علی کا اچانک ایک سفر کے دوران انبالہ میں انتقال ہوگیا۔

شاہ احسان علی کے تعلیم کئے ہوئے معمولات کا تاحیات اہتمام: اگرچہ شاہ احسان علی صاحب سے میانجیو کو اجازت و خلافت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد دوسرے مرشدین سے رجوع ہوگئے تھے مگر آخری زمانہ حیات تک شاہ احسان علی کے تعلیم کئے ہوئے معمولات پر اہتمام سے کاربند رہے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں جب تک شاہ احسان علی کے بتائے ہوئے معمولات پورے نہیں کرلیتا' میری طبیعت خوش نہیں ہوتی۔

"تا وقتے کہ اشغال فرمودہ حضرت شاہ احسان علی رحمۃ اللہ علیہ رانمی کنم طبع درست و خوش نمی شود۔" (۲۹)

۲۹۔ بیاض دلکشا ۱۵۲۔

جب تک میں حضرت شاہ احسان علی صاحب کے تعلیم فرمائے ہوئے اور اد و معمولات پورے نہیں کر لیتا، میری طبیعت بحال اور خوش نہیں ہوتی"

شاہ عبدالرحیم ولایتی سے رجوع شاہ احسان علی کی وفات کے بعد حضرت میانجیو نور محمد، شاہ عبدالرحیم ولایتی کے دامن تربیت سے منسلک ہو گئے، شاہ عبدالرحیم سے حضرت میانجیو کی واقفیت غالباً خاصی پرانی تھی، شاہ عبدالرحیم اور شاہ عبدالعلیم لوہاروی کے والد اخوند جان محمد ہندوستان کے سفر اور ذوق معرفت میں ان کے رفیق تھے، اس نسبت نیز شاہ احسان علی وغیرہ کی وجہ سے شاہ عبدالرحیم کا بھی جلال آباد لوہاری سے ایک رشتہ جڑا ہوا تھا وہ بھی کبھی کبھی ان مواضعات میں آتے رہتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم سے رجوع کئے غالباً زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ شروع سنہ ۱۲۳۴ھ میں حضرت سید احمد شہید اس نواح (دیوبند، سہارنپور، لوہاری، کاندھلہ) کے سفر پر تشریف لائے (۲۰)۔ اس وقت جب حضرت سید صاحب سہارنپور میں تھے، حضرت میانجیو نور محمد کو حضرت سید صاحب سے استفادہ کی سعادت میسر آئی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب نے پیر و مرید (شاہ عبدالرحیم و میانجیو نور محمد) دونوں کو غالباً بیک وقت اجازت عطا فرمائی۔

حضرت سید صاحب اور شاہ عبدالرحیم سے اجازت کی کچھ تفصیل حضرت سید صاحب سہارنپور وغیرہ سے راستہ کی بستیوں، قصبات سے گذرتے، قیام فرماتے ہوئے (سنہ ۱۲۳۴ھ میں) لوہاری تشریف لائے، اس سفر میں میانجیو صاحب، سید صاحب کے ہم رکاب تھے، لوہاری آنے کے بعد (۲۱) حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب

۲۰۔ حضرت سید احمد شہید کی ملفوظات پر حضرت مفتی الٰہی بخش کی کتاب ملہمات احمدیہ کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب ۱۷ ربیع الاول ۱۲۳۴ کو لوہاری میں تشریف فرما تھے اور وہیں مفتی صاحب کی سید صاحب سے غالباً پہلی ملاقات ہوئی تھی، نیز ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید ص ۱۷۱ ج ۱۔

۲۱۔ مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا نصر اللہ خاں خویشگی دونوں نے وہ اجازت نامہ نقل کیا ہے جو عطائے خلافت کے وقت شاہ عبد الرحیم صاحب نے میانجیو نور محمد کے لیے تحریر فرمایا تھا اور مولانا شیخ محمد نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ "تحریر فرمودہ از سہارنپور، بمقام لوہاری ارسال داشتند ہنگام رونق افروزی آں جناب نزد جناب میر صاحب حضرت سید احمد صاحب قبلہ دربلدہ سہارنپور" انوار محمدی ص ۳۵۔

نے میانجیو صاحب کو سلسلہ چشتیہ کی اجازت سے نوازا' اس کے علاوہ حضرت میانجیو صاحب کو کس سلسلہ میں کس سے اجازت ہے اس میں الگ الگ اطلاعات ہیں حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی نے "ارشاد محمدی" میں صاف لکھا ہے :

"حضرت میانجیو صاحب نے تمام سلاسل کی تکمیل حضرت سید احمد شہید سے کی تھی صرف چشتیہ صابریہ کی شاہ عبدالرحیم ولایتی سے کی"۔ (۳۲)

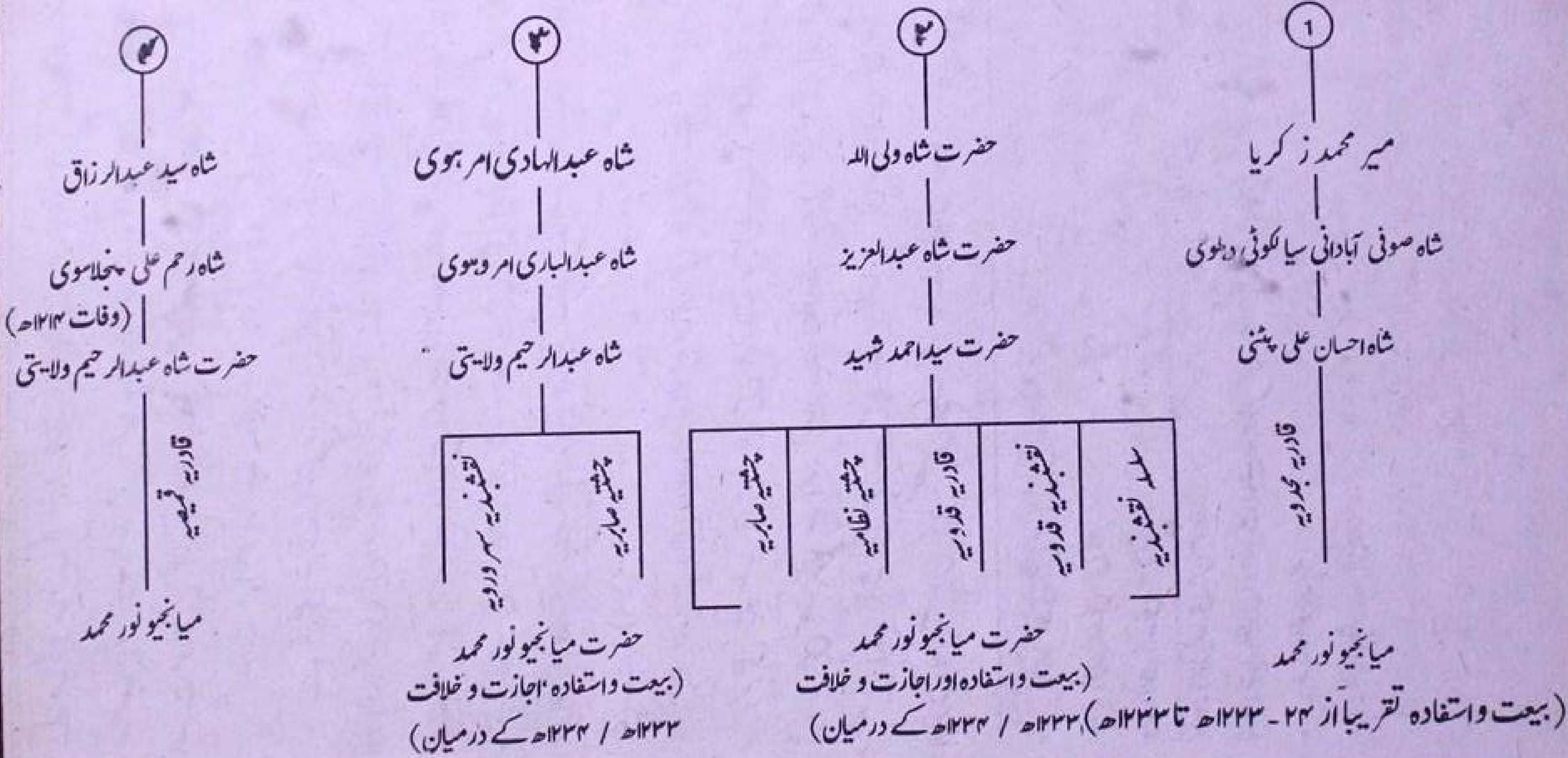
اور انوار محمدی میں سب سلسلوں کے شجرے بھی درج کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میانجیو صاحب کو حضرت سید صاحب سے سلسلہ نقش بندیہ میں (۳۳)، سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں (۳۴) اور چشتیہ صابریہ میں بھی اجازت حاصل تھی (۳۵) اور شاہ عبدالرحیم ولایتی سے علاوہ چشتیہ صابریہ کے ایک سلسلہ اجازت' نسبت سہروردیہ کا بھی ہے" (۳۶)

حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کا ارشاد ہے کہ عبدالرحیم کو بواسطہ سید رحم علی شاہ سلسلہ قادریہ قمیصیہ میں اجازت حاصل ہے (۳۷) 'اور سلسلہ نقش بندیہ قدوسیہ میں حضرت سید احمد شہید سے اجازت ہے (۳۸)' ذیل میں ان سلسلوں کی تفصیل ایک نقشہ کی صورت میں یک جا کردی گئی ہے اس کی مدد سے ان سب اجازت اور سلسلوں کی تفصیل بیک نظر سامنے آجاتی ہے۔

---

۳۲ - ارشاد محمدی ص ۲ (مطبع دارالعلوم میرٹھ)
۳۳ - انوار محمدی ص ۲۱ -
۳۴ - انوار محمدی ص ۳۲ -
۳۵ - انوار محمدی ص ۳۳ -
۳۶ - ضیاء القلوب، حضرت حاجی امداد اللہ ص ۲۰، ۲۴ (فخر المطابع لکھنؤ : ۱۳۲۴ھ)
۳۷ - ضیاء القلوب ص ۶۲ -
۳۸ - ضیاء القلوب ص ۶۳ -

حضرت میانجیو نور محمد کو مختلف مشائخ سے حاصل اجازت (اور سلسلوں) کی تفصیلات



سفر جہاد : حضرت میانجیو صاحب سہارنپور کے سفر کے دوران حضرت سید احمد سے وابستہ ہوئے تھے اور حضرت سید احمد کی حیات تک استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض اطلاعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میانجیو صاحب سفر جہاد میں بھی سید صاحب کے رفیق رہے (۳۹) اور بعض معرکوں میں شرکت فرمائی۔ مگر مطبوعہ مآخذ میں اس کی کوئی تفصیل دریافت نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میانجیو سفر جہاد کے لیے کب روانہ ہوئے اور کب تک اس سفر میں سید صاحب کے ہم رکاب رہے واپسی کی تاریخ کا بھی سراغ نہیں ملتا' یہ تو طے ہے کہ ان آخری معرکوں میں جس میں یہ قافلہ، شہداء سرخ رو اور فائز المرام ہوا میانجیو صاحب موجود نہیں تھے میانجیو صاحب کا سید صاحب کی رفاقت ترک کر کے وطن آنا یقیناً حضرت سید صاحب کی ہدایت و ارشاد کے مطابق ہی ہوا ہو گا۔ بہر حال یہ موضوع مزید معلومات کو منتظر ہے۔

مولانا خویشگی کی میانجیو نور محمد سے ملاقات کا تذکرہ : یہ تذکرہ آچکا ہے کہ میانجیو صاحب کی شاہ عبدالعلیم لوہاروی سے بہت گہری دوستی تھی اور مختلف معاملات و مسائل میں دونوں ایک دوسرے کے ہمراز و دمساز تھے اور باہمی بے تکلف ملاقاتوں کے باوجود دونوں کے دل میں ایک دوسرے کا پورا احترام اور ان کے کمالات کی پوری پوری قدر و منزلت تھی' چنانچہ جب مولانا خویشگی بجنور میں ملازم تھے (بعد ۱۲۵۴ھ) تو شاہ عبدالعلیم نے مولانا خویشگی کو ہدایت فرمائی تھی کہ اس زمانہ میں دو بزرگ لائق زیارت ہیں ایک میانجی غلام محمد صاحب سہارنپوری (۴۰) جو شاہ احسان علی کے احباب میں ہیں دوسرے میانجیو نور محمد صاحب جھنجھانوی۔

۳۹۔ کاروان ایمان و عزیمت (تذکرہ خلفاء حضرت سید احمد شہید) حضرت سید ابوالحسن علی ندوی ۱۲۶۔ (طبع اول لاہور : ۱۴۰۰ھ)

۴۰۔ میانجی غلام محمد صاحب سہارنپور کے رہنے والے اور حضرت شاہ احسان علی پٹنی کے ممتاز رفقاء اور خلفاء میں سے تھے، مولانا خویشگی نے ان کا بیاض دلکشا میں کئی موقعوں پر تذکرہ کیا ہے حافظ غلام محمد صاحب کی محرم سنہ ۱۲۶۵ھ میں وفات ہوئی۔ اگرچہ بیاض دلکشا میں یہ سنہ ۱۲۹۵ھ چھپا ہوا ہے مگر وہ یقیناً درست نہیں کیونکہ اس کے بعد ہی یک ہزار و دوصد و شصت و پنج کی صراحت ہے۔

مولانا خویشگی، میانجی غلام محمد کے فیض صحبت سے پہلے سے بھی مستفید تھے بعد میں اور اہتمام سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے (۴۱) مگر اس وقت تک حضرت میانجیو نور محمد کی زیارت کا موقع نہیں ملا تھا، شاہ عبدالعلیم نے ہدایت فرمائی تو میانجیو نور محمد کی خدمت میں لوہاری حاضر ہوئے، شاہ عبدالعلیم کا سلام و پیام پہونچایا اور یہ شعر عرض کیا:

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

میانجیو نور محمد صاحب یہ شعر سن کر بہت ہنسے اور فرمایا میرے طریقے میں نسبت ارادی اور اختیاری نہیں ہے بلکہ وہبی ہے، کچھ دن میرے پاس آؤ یہاں رہو، اگر تمہاری قسمت کی کوئی چیز ہوگی مل جائے گی۔ مولانا خویشگی نے جواب میں کہا، اگر مجھے فرصت میسر ہوگی تو اپنے پیر کی صحبت کو غنیمت سمجھوں گا یہاں کیوں آؤنگا (۴۲) میانجیو اس جواب سے بے حد خوش ہوئے پھر فرمایا کہ جب تک میں شاہ احسان علی کے تعلیم کئے ہوئے معمولات پورے نہیں کر لیتا ہوں طبعیت خوش نہیں ہوتی۔

میانجیو صاحب کے خلفاء اور حافظ ضامن صاحب کی جانشین کے اعلان کا ارادہ

حضرت میانجیو صاحب اگرچہ متعدد سلسلوں کے جرعہ نوش اور متعدد مرشدین سے صاحب اجازت تھے مگر تواضع و انکسار اور خود کو کچھ نہ سمجھنے اور آخری حد تک لوگوں کی نگاہوں سے اپنے مقام و مرتبہ اور خصوصیات کو چھپانے کا ذوق طبعیت ثانیہ بن گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بہت کم لوگوں کو بیعت کیا اور معدودے چند اصحاب ایسے تھے جن کو اجازت و خلافت عطا فرمائی، تاہم میانجیو صاحب کی خدمت کے حاضر باش اور دوسرے اہل کمال جانتے تھے کہ اس گلشن پر عنقریب بہار آئے گی اور اس کی خوشبو دور دور تک پھیلے گی۔

۴۱۔ بیاض دلکشا ص ۱۵۰۔
۴۲۔ بیاض دلکشا ص ۵۲، ۱۵۱۔

اس گفتگو کے دوران ہی مولانا نصر اللہ خاں خویشگی نے میاجیو سے بطور خاص گذارش کی کہ اپنے خلفاء میں سے جس نے بھی سیر سلوک پوری طرح مکمل کرلی، ہو اس کو اپنا خلیفہ اور جانشین طریقت نامزد فرمادیجئے، حضرت صاحب نے فرمایا حافظ ضامن ہیں جنھوں نے میری رہنمائی میں سیر سلوک مکمل کی ہے، تھانہ بھون کے رہنے والے حاجی امداد اللہ اور مولوی شیخ محمد بھی سیر سلوک میں مشغول ہیں۔

مولانا نصر اللہ خاں صاحب نے اس پر عرض کیا کہ کسی دن اہل علم اور درویشوں کو جمع فرما کر اس کا اعلان کردیں تو بہتر ہے میں بھی اس محفل میں حاضر ہوجاؤں گا، میاجیو صاحب نے فرمایا: ہاں بہت اچھا ہے، انشا اللہ تعالیٰ ایسی تقریب کا انتظام کیا جائے گا:

"بسیار بہتر است، انشاء اللہ تعالیٰ ایں تقریب کردہ خواہد شد" (۴۲)

مگر یہ ارادہ پورا نہیں ہوا تھا کہ مولانا خویشگی اعظم گڈھ چلے گئے اور حضرت میاجیو صاحب کی وفات ہوگئی۔

اس ملاقات میں میاجیو صاحب نے مولانا خویشگی کو بہت سی نصیحتیں کیں اور فرمایا کہ تم نوکری کیوں کرتے ہو (خویشگی، انگریزی حکومت کی ملازمت میں بہ عہدہ ڈپٹی کلکٹر متعین تھے) روزی حاصل کرنے کے لیے تمہاری علمی لیاقت و صلاحیت ہر طرح سے کامیاب و مکمل ہے، میں (میاجیو) باقاعدہ عالم نہیں ہوں مگر اپنے گذر اوقات کا انتظام کرلیتا ہوں، چاہیئے کہ ملازمت ترک کردو اور مخلوق خدا کی رہنمائی میں مشغول ہوجاؤ اور جن چیزوں کی مخالفت آئی ہے ان سے بچو، خویشگی نے عرض کیا میں اس سلسلہ میں معذور ہوں کہ یہ تسمہ میرے گلے میں باندھا گیا ہے جب تک یہ نہ کھولا جائے میں خود سے نہیں کھولوں گا، اور یہ سب فیض ربانی ہے، اس پر میاجیو صاحب خاموش ہوگئے۔

مولانا خویشگی کی شاہ عبدالعلیم سے ارادت و نسبت کے علاوہ، حضرت میاجیو کی مولانا خویشگی سے قربت و اختصاص کا ایک محرک اور ہوگیا تھا، میاجیو

۴۲۔ بیاض دلکشا ص ۱۵۲۔

کے حقیقی بھتیجے میاں عبدالعزیز (۴۴) (خلف کمال محمد بن جمال محمد ثانی) معاشی پریشانی میں مبتلا تھے اور نہایت عسرت سے گزر ہو رہی تھی، مولانا خویشگی کے پہلے پیر و مرشد شاہ سید نیاز علی لوہاروی (۴۵) نے خویشگی سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ میانجیو صاحب بھی چاہتے ہیں کہ ان کے لیے معاش کا کچھ انتظام ہو جاتے، اس وقت تو خویشگی خاموش ہو گئے بعد میں جب ملازمت کا ایک موقعہ نکلا تو مولانا خویشگی نے سید نیاز علی صاحب کو اطلاع دی، انھوں نے یہ اطلاع حضرت میانجیو کو پہنچائی، میانجیو صاحب نے نصر اللہ خاں خویشگی کو خط لکھا، میاں عبدالعزیز (غالباً میانجیو کا یہ خط لے کر) مولانا خویشگی کے پاس مظفر نگر پہونچے اور ایک کام پر لگ گئے یہ ملازمت شخصی نوعیت کی تھی سرکاری نہیں تھی، چونکہ حضرت میانجیو صاحب نے سرکاری ملازمت کو مولانا خویشگی کے لیے ناپسند کیا تھا اس لیے مولانا خویشگی کو خیال ہوا کہ میانجیو صاحب ان کے لیے بھی اس کو پسند نہیں کریں گے لیکن میانجیو صاحب کا ایماء یہ تھا کہ میاں عبدالعزیز کو کوئی سرکاری ملازمت مل جائے۔ اس لیے مولانا خویشگی نے میانجیو صاحب کو لکھا کہ:

"عجب است از تجویز جناب کہ بندہ را از ملازمت منع فرمودند، و میاں

۴۴۔ میاں عبدالعزیز، حضرت میانجیو صاحب کے حقیقی بھتیجے تھے اور جیسا کہ خویشگی کی تصریح سے معلوم ہو رہا ہے۔ میانجیو صاحب کی حیات میں مظفر نگر میں ملازم ہو گئے تھے۔ بعد میں اور جگہوں پر سلسلہ ملازمت رہا میاں عبدالعزیز کو مولانا نصر اللہ کے ارادت و بیعت کی وجہ سے شاہ عبدالعلیم لوہاروی کی خدمت میں بھی نیاز حاصل تھا اور وہ شاہ عبدالعلیم سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں جاتے رہتے تھے۔ (بیاض دلکشا ص ۱۴۲، ۱۴۳) جس وقت مولوی فرید احمد غازی پوری نے ۱۳۱۹ھ۔ ۱۹۰۲ء میں در فرید لکھی اس وقت میاں عبدالعزیز صاحب جے پور میں ملازم تھے جس کا فرید احمد صاحب نے تذکرہ کیا ہے (در فرید ص ۲۵، مطبع دارالعلوم میرٹھ)۔

میاں عبدالعزیز بعد میں جے پور سے پھپھوند (ضلع اٹاوہ) آ گئے تھے ان کی اولاد بھی وہیں رہی اس کے کچھ عرصہ بعد یہ لوگ کیرانہ منتقل ہو گئے تھے اب بھی اس خاندان کے چند افراد کیرانہ میں موجود ہیں، مگر اپنے آباؤ اجداد سے بے خبر۔

۴۵۔ شاہ سید نیاز علی لوہاروی مولانا خویشگی کے پہلے پیر و مرشد تھے خویشگی نے محبت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ بیاض دلکشا ص ۷۷، ۹۴، ۱۵۲۔

عبدالعزیز را جائز فرمودند" (۴۶)

جناب والا کی یہ رائے عجیب ہے کہ مجھے (انگریزی سرکار کی) ملازمت سے منع فرماتے ہیں اور میاں عبدالعزیز کے لیے اس کو درست خیال فرماتے ہیں"

اس کے جواب میں میانجیو صاحب نے ایک مفصل خط مولانا خویشگی کو لکھا جو مولانا خویشگی کے نام میانجیو صاحب کا دوسرا گرامی نامہ ہے، اس کا حاصل دو اشعار ہیں اس میں خویشگی کے سوال کا جواب بھی ہے اور میاں عبدالعزیز اور مولانا خویشگی کی اندرونی کیفیت میں جو نمایاں امتیاز تھا اس کا اشارہ بھی:

منزل عشقت مکانے دیگر است
مرد ایں رہ را نشانے دیگر است
کشتگان خنجر تسلیم را
ہر کماں از غیب جان دیگر است (۴۷)

اس وقت میانجیو صاحب نے میاں عبدالعزیز کو بھی ایک خط لکھا تھا خویشگی نے وہ خط بھی اپنے نام خطوط کے ساتھ درج کر کے محفوظ کر دیا ہے۔

چونکہ حضرت میانجیو کے گنتی کے چند قلمی تحریری آثار معلوم ہیں جس میں صرف یادگار کی حیثیت سے سب سے بلند مقام اور عالی مرتبت یادگار وہ قرآن شریف ہے جو حضرت میانجیو صاحب کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے اور ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔

دیگر آثار میں صرف وہ چار مکتوب گرامی شامل ہیں جو حضرت حاجی امداد اللہ حضرت حافظ محمد ضامن تھانوی، اور مولانا شیخ محمد تھانوی کے نام ہیں۔ یہ مکتوبات

۴۶۔ بیاض دلکشا ص ۱۵۴۔

۴۷۔ یہ اشعار حضرت احمد جام (وفات سنہ ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء) کے ہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی زبان مبارک پر وفات کے وقت یہی اشعار تھے۔ حاشیہ سیر الاولیاء، اردو ترجمہ از اعجاز الحق قدوسی ص ۱۴۲ (لاہور: ۱۹۸۰ء)

مولانا شیخ محمد نے انوار محمدی میں درج کئے ہیں، مذکورہ بالا مکتوبات کے علاوہ حضرت میانجیو صاحب کی کسی اور مطبوعہ تحریر کا راقم سطور کو علم نہیں۔

وفات: حضرت میانجیو صاحب لوہاری میں قیام فرما اور تعلیم و افادہ میں مشغول تھے کہ اچانک تپ و لرزہ کی وبا آئی اور حضرت میانجیو صاحب بھی اس میں مبتلا ہو کر چند روز میں واصل بحق ہو گئے۔ وفات سے دو تین دن پہلے لوہاری سے جھنجھانہ تشریف لے آئے تھے یہیں وفات ہوئی۔

صحیح تاریخ وفات؟: وفات کب کون سی تاریخ کو ہوئی اس کی حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا شیخ محمد تھانوی کی تحریرات میں صراحت نہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ کے اشعار گذر چکے ہیں۔ سنہ وفات سے متعلق شعر مکرر پڑھ لیجئے:

بارہ سو انسٹھ میں کر کے انتقال اس جہاں سے جا ملے با ذو الجلال (۴۸)

مولانا شیخ محمد تھانوی نے اگرچہ انوار محمدی اور دفتر مثنوی مولانا روم میں (۴۹) حضرت میانجیو صاحب کا تذکرہ کیا ہے لیکن تاریخ یا سنہ وفات ذکر نہیں کیا، مگر مولانا نصر اللہ خاں خویشگی میانجیو کی تاریخ وفات صاف طور پر چہارم شوال روز شنبہ ۱۲۵۹ھ" (۵۰) (مطابق ۲۹۔ اکتوبر ۱۸۴۳ء) تحریر کی ہے، چوں کہ حضرت میانجیو کی تاریخ وفات پر یہ سب سے پرانی اور ایسے شخص کی اطلاع ہے جن کی حضرت میانجیو سے براہ راست ملاقات اور مراسلت تھی، ۴ رمضان المبارک کی روایت کا سب سے پہلا راوی کون ہے، ہمیں معلوم نہیں ۴ رمضان المبارک تاریخ وفات غالباً سب سے پہلے مولوی محمد حسین مراد آبادی نے لکھی ہے (۵۱)۔ بہ ظاہر مولانا خویشگی کی اطلاع درست ہے۔ تاریخ ۴ رمضان المبارک ہو یا ۴ شوال، اس پر اتفاق ہے کہ سنہ ۱۲۵۹ھ تھا۔

۴۸۔ غذائے روح ص ۵ (مشمولہ کلیات امدادیہ ص ۱۲۷)۔

۴۹۔ دفتر ہفتم، مثنوی مولانا روم ص ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۰۸۔ (محبوب المطابع میرٹھ: ۱۳۰۷ھ)۔

۵۰۔ بیاض دل کشا ص ۱۵۹۔

۵۱۔ انوار العارفین فارسی ص ۵۲۱، ۵۲۲ (نول کشور، لکھنؤ: ۱)

حضرت حاجی صاحب، مومن خاں نیز میانجیو صاحب کے ہم وطن اور ان کی زیارت سے مستفید ایک خاص شخصیت حکیم عبدالرحمن حیرت جھنجھانوی (وفات ۱۳۰۲ھ) نے بھی سنہ وفات ۱۲۵۹ھ ہی لکھا ہے۔ (۵۲)

قطعات تاریخ وفات مومن خاں مومن کے میانجیو نور محمد سے بظاہر قدیم گہرے مراسم تھے اور وہ میانجیو صاحب کے نہایت معتقد و معترف تھے اس کا اندازہ میانجیو صاحب کی وفات پر مومن کے کہے ہوئے قطعات تاریخ سے ہوتا ہے۔ مومن نے میانجیو نور محمد کے فارسی اور اردو دونوں میں الگ الگ قطعات تاریخ لکھے دونوں سے میانجیو کے کمال و عظمت کے اعتراف اور میانجیو صاحب سے مومن کی دلی ارادت کا علم ہوتا ہے، فارسی کے قطعہ تاریخ میں "نور محمد در بہشت" کے اعداد سے سنہ نکالا گیا ہے، پورا قطعہ، تاریخ یہ ہے:

بیتاب شد خلد بریں آمد بہ بالیں حور عیں
آسودہ تازیر زمیں آں صوفئ صافی سرشت
سال رحیلش زیں جہاں، سوئے جناں جستم زجاں
گفتا سروش غیب داں، "نور محمد در بہشت" (۵۳)

اردو کا قطعہ تاریخ یہ ہے:

خلیفہ نور محمد وہ شمع بزم حضور
کہ جس سے زیر زمیں تابہ آسماں روشن
مکاشفات کا احوال کیا کہوں ان کے
تمام حال جہان و جہانیاں روشن

۵۲۔ سفینۂ رحمانی عبدالرحمن حیرت جھنجھانوی ص ۱۱۸، ۱۱۹۔ مطبع نولکشور (لکھنئو: ۱۸۸۴ء)

۵۳۔ دیوان فارسی، مومن خاں مومن ص ۱۲۵۔ (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی: ۱۲۷۱ھ)
مومن کا فارسی دیوان مطبوعہ تقریباً معدوم ہے، برصغیر کی کسی بھی معروف لائبریری میں اس کے مطبوعہ نسخہ کی موجودگی کا علم نہیں تاہم اس اشاعت کا ایک کسی قدر ناقص نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

خیال سال وفات ان کا جب کیا میں نے
ہوا درونہ مثال ستارگاں روشن
نکالا سال میں، اس مصرع دل آرا سے
"زوان نور محمد سے ہے جہاں روشن" (۵۴)

۱۲۵۹ھ

مدفن: حضرت میانجیو صاحب، جھنجھانہ کی مشہور شخصیت سید محمود سبزواری (۵۵) (شہید ۱۴ محرم ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ء) کے مزار کی غربی جانب دفن کئے گئے۔ رحمہ اللہ و رضی عنہ۔

مولانا شاہ عبدالعلیم لوہاروی: حمید (۵۶) ضلع ہزارہ صوبہ سرحد (پاکستان) کے ایک نیک باشندے خاں بہادر تھے ان کے دو فرزند ہوئے، جان محمد، فیض محمد۔ یہ دونوں ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے تھے، فیض محمد کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں صرف یہ اطلاع دستیاب ہے کہ وہ انبالہ کے ایک مدرسہ میں مدرس ہو گئے تھے (۵۷) اور ان کے دو بیٹے تھے غلام قادر اور غلام محمد، جو اپنے چچا زاد بھائی مولانا

۵۴۔ کلیات مومن، اردو ۱۱۷، ۱۱۸ ج ۲۔ (لاہور: ۱۹۶۴ء)
(سوانح حضرت میانجیو نور محمد ۔ ۱۲۲ جھنجھونہ ۱۹۸۵ء)

۵۵۔ سید محمود سبزواری کے متعلق معروف روایت یہ ہے کہ وہ سبزوار (بیہقی، افغانستان) کے شہزادے یا کسی بڑے گھرانے کے فرد تھے جو اس علاقے میں جہاد کے لیے تشریف لائے اور تراوڑی کے میدان میں محمد غوری کی فتوحات سے کچھ پہلے موجودہ ہریانہ کی مشرقی اور یوپی کی مغربی کی سرحد پر واقع قصبات کو فتح کیا جس میں کیرانہ، جھنجھانہ، بڑھانہ، بنت اور اس کے اطراف و نواح کی بستیاں مثلاً تھانہ بھون و کاندھلہ وغیرہ شامل ہیں۔ سید صاحب کے جہاد اور فتوحات کے متعلق معلومات کے لیے ملاحظہ ہو، تاریخ محمودی ترجمہ کتاب الشہادت، تالیف شاہ غلام شرف جھنجھانوی مرتبہ ۱۱۳۰ھ ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (مطبوعہ جھنجھانہ: ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء)

مگر افسوس ہے کہ اس عہد کی (ہندوستان اور افغانستان دونوں جگہوں کی) تاریخوں میں سید محمود سبزواری کے ہندوستان آنے اور ان معرکہ آرائیوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

۵۶۔ بیاض دلکشا ص ۱۹۔

۵۷۔ بیاض دلکشا ص ۱۹۔

شاہ عبدالعلیم اور ان کے خلیفہ، اول مولانا نصر اللہ خاں سے بیعت و مستفید تھے۔

اخوند جان محمد اور ان کی اولاد کا کسی قدر مفصل حال معلوم ہے 'اخوند جان محمد، معرفت الٰہی کی جستجو میں حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کے ہمراہ اپنے علاقہ سے ہندوستان پہنچے کیونکہ شاہ عبد الباری نے اخوند جان محمد کی بیعت لینے سے معذرت فرمادی تھی اور کہہ دیا تھا کہ تمہارا حصہ شاہ غلام علی کے پاس ہے (۵۸)۔ اس لیے وہاں سے رخصت ہو کر دہلی شاہ غلام علی کی خانقاہ میں حاضر ہوئے، زندگی کا بڑا حصہ شاہ غلام علی کی خدمت میں گزارا، آخر میں لوہاری آگئے تھے اور یہیں رہائش اختیار کی (۵۹) اور یہیں چھیانوے سال کی عمر میں ۱۲۵۲ھ میں وفات ہوئی (۶۰) کا نکاح بی بی مراد خاتون سے ہوا تھا، مراد خاتون کا ۱۴ شعبان ۱۲۵۵ھ (۲۲ اکتوبر ۱۸۳۹ء) کو انتقال ہوا، دونوں لوہاری میں مسجد عیسی شاہ سے متصل، گوشہ جنوب مشرق میں دفن ہیں (۶۱)۔

بی بی مراد خاتون کے بطن سے اخوند جان محمد کی دو اولادیں ہوئیں۔ ایک دختر ایک پسر، بیٹے کا نام اللہ داد رکھا گیا جو بعد میں تبدیل کر کے عبدالعلیم کر دیا گیا تھا، یہی شاہ عبدالعلیم تھے جو حضرت میانجیو نور محمد کے رفیق اور مولانا نصر اللہ خاں کے پیر و مرشد ہوئے، شاہ عبدالعلیم کا کچھ وقت والد کے ساتھ حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں گذرا، جب کچھ ہوشیار ہو گئے تو لوہاری مولانا محمد صادق کی خدمت میں تعلیم کے لیے حاضر ہوئے، تعلیم سے فراغت کے بعد دوبارہ کچھ عرصہ دہلی میں خانقاہ شاہ غلام علی کے سائے میں گذرا۔

اوپر گذر گیا ہے کہ شاہ عبدالعلیم نے جب پہلی ملاقات میں شاہ احسان علی سے بیعت کی درخواست کی تھی تو اس وقت شاہ احسان علی صاحب نے معذرت فرمادی تھی۔ لیکن شاہ احسان علی کی خدمت میں آنے جانے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

۵۸۔ بیاض دلکشا ص ۲۱۔

۵۹۔ بیاض دلکشا ص ۲۲، ۲۹۔

۶۰-۶۲۔ حوالہ بالا۔ نیز در فرید مولوی فرید احمد غازی پوری ص ۲۴، ۳۲ (مطبع دارالعلوم میرٹھ: ۱۳۱۲ھ)

بعد میں کسی وقت شاہ احسان علی کے دامن اصلاح و تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے، یہ واقعہ کب پیش آیا اس کا مولانا خویشگی نے تذکرہ نہیں کیا، بہر حال شاہ عبدالعلیم نے پیر و مرشد سے پورا استفادہ کیا، مراتب سلوک طے کئے اور اجازت و خلافت سے نوازے کئے شاہ احسان علی کی وفات کے بعد خود بھی ممتاز و مقبول مشائخ میں شمار کئے گئے مولانا عبدالعلیم کا حلقہ ارادت و ارشاد بہت وسیع تھا، مولوی محمد فرید غازی پوری نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب کے ایک لاکھ مرید تھے (۶۲)۔

شاہ عبدالعلیم حج کے ارادہ سے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں سفر پر نکلے، بمبئی پہنچ گئے تھے لیکن سخت بیماری ضعف اور وقت کم رہ جانے کی وجہ سے سفر پر جانا مشکل ہو گیا، اس لیے واپسی کا ارادہ کر لیا، واپسی میں بھوپال میں پہنچ کر درد سر کی سخت تکلیف میں مبتلا ہوئے جس میں روزانہ اضافہ ہوتا رہا اور اسی بیماری میں مبتلا رہ کر پنجشنبہ ۱۲ محرم ۱۲۶۶ھ (۲۹ نومبر ۱۸۴۹ء) کو بھوپال میں رحلت کی اور جہانگیر آباد، بھوپال میں دفن کئے گئے۔ (۶۳)

مولانا خویشگی نے شاہ عبدالعلیم کے ۱۲ خلفاء کے نام لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعض اور بزرگوں کے متعلق خیال ہے کہ ان کو بھی میرے حضرت (شاہ عبدالعلیم) سے اجازت حاصل ہے (۶۴)۔

مولانا نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی مولانا نصر اللہ خاں خویشگی کا، جیسا کہ نسبتوں سے ظاہر ہو رہا ہے پٹھان خاندان سے تعلق تھا، ان کے آباء و اجداد شاہجہاں کے دور میں غزنی سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے، اول قصور میں قیام کیا، بعد میں خورجہ آئے اور مستقل یہیں رہے (۶۵)۔ اس خاندان نے اس نواح خصوصاً خورجہ میں وقار و احترام حاصل کیا، اس خاندان کے ایک فرد حکیم محمد عمر خویشگی تھے، ان

۶۲۔ در فرید ص ۵۴۔

۶۳۔ بیاض دلکشا ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

۶۴۔ بیاض دلکشا ص ۱۶۳۔

۶۵۔ بیاض جانفزا، خاتمہ بیاض دلکشا، مولوی فرید احمد غازی پوری ص ۹-۱۰ مطبع الٰہی (آگرہ:)

کے تین فرزند ہوئے جس میں ایک مولانا نصر اللہ خاں تھے صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں ۔قرائن کی مدد سے تقریباً ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) معلوم ہوتا ہے ۔ کم سن تھے کہ والد کی وفات ہو گئی تو مولانا نصر اللہ کے ماموں فتح علی خاں نے اپنی نگرانی و تربیت میں لے لیا اور اپنے ساتھ اعظم گڈھ لے گئے ۔ جہاں وہ تحصیل دار تھے ۔ (۶۶)

شروع میں تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں تھی مگر ایک واقعہ کی وجہ سے سخت غیرت آئی ' سترہ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی ' مولانا چراغ علی سے تعلیم کا آغاز کیا ۔اس کے بعد متوسط کتابوں شرح ملاجامی وغیرہ سے آخر تک باقی ماندہ تمام کتابیں مولانا احمد علی چریا کوٹی سے پڑھیں مولانا احمد علی کے بنارس کے زمانہ قیام کے دوران تین سال تک مولانا کی خدمت میں بنارس میں قیام رہا۔

مولانا احمد علی کی صحبت ' عالی حوصلہ شاگرد کے لیے اکسیر ثابت ہوئی ۔ مولانا خویشگی نے متداولہ سب علوم میں مہارت حاصل کی تعلیم علوم و فنون نیز اہل کمال سے استفادہ کا 'مولانا کا ذوق ہمیشہ ترو تازہ رہا 'اگرچہ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت پر تقرر ہو گیا تھا اور اس میں ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ تک پہنچے مگر اس اہم ملازمت سرکاری ذمہ داریوں اور مصروفیات کے باوجود جہاں رہے وہاں تعلیم و استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔

بنارس کے زمانہ تعلیم میں پہلی مرتبہ شاہ عبدالعلیم بوہاروی کی زیارت ہوئی ۱۲۴۷ھ میں سلسلہ قادریہ میں شاہ صاحب سے بیعت کی 'ذی الحجہ ۱۲۵۲ھ (۲۰ مارچ ۱۸۲۷ء) میں اجازت و خلافت سے نوازے گئے (۶۷)۔

سرکاری ملازمت کا سلسلہ اپنے ماموں فتح علی خاں کی جگہ ' جنکی وفات ہو گئی تھی رمضان المبارک ۱۲۴۹ھ (فروری ۱۸۳۴ء) میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ' دو سال اس عہدہ پر کام کیا ۔۱۲۵۶ھ میں تحصیلدار بنائے گئے 'اس کے بعد مین پوری کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے پھر الہ آباد گئے ' بعد ازاں بجنور میں تبادلہ ہوا ' دو سال تک

---

۶۶ ۔ بیاض جانفزا ، ص ۱۶ ۔

۶۷ ۔ بیاگ دلکشا ص ۱۲۱ '۱۷۰ ۔

بجنور میں تعینات رہے، ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) میں بجنور سے مظفر نگر میں تبادلہ ہوا۔ آخر میں گڑگاؤں آ گئے تھے۔ گڑگاؤں میں تھے کہ ۱۸۵۷ء کے حوادث پیش آئے، اس وقت مولانا خویشی کا رمفوضہ چھوڑ کر دہلی میں شاہ آبادانی کی خانقاہ میں آ کر پڑ گئے تھے۔ امن و امان ہونے بعد ملازمت سے مستعفی ہو گئے، اور چند روز کے لئے آگرہ کے ایک ہندو رئیس کے ملازم رہے، پھر کپورتھلہ کی ریاست سے متعلق ہو گئے شعبان ۱۲۸۱ھ میں حیدر آباد سے ملازمت کی پیش کش ہوئی، مولانا نے اس پیش کش کو قبول کر لیا حیدر آباد چلے گئے اور وہاں بہت اعزاز و ناموری کے ساتھ ملازمت کا عرصہ گزرا۔ (۶۸)

۱۲۹۲ء میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے، صفر ۱۲۹۳ء میں سفر حج سے بمبئی واپس پہنچے، حج کے دوران شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی، مہاجر مدنی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے ملاقات کا موقعہ ملا (۶۹)۔

۲ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ دوشنبہ کو فالج ولقوہ کا حملہ ہو گیا کچھ دن بعد صحت ہو گئی شروع محرم ۱۲۹۸ھ میں دوبارہ بیمار ہو گئے، علالت کا سلسلہ دراز ہوا، بالآخر اسی بیماری میں ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء) میں صبح صادق کے بعد خورجہ میں انتقال ہوا، (۷۰) جس کا اہل قصبہ کو ازحد رنج و ملال ہوا، اہل قصبہ کے تاثرات اور حاضرین جنازہ کی کیفیت کا اندازہ مولانا کے جنازہ میں حاضر، ایک شخص مصطفیٰ خان صاحب کی یادداشت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"۲۷ ماہ محرم ۱۲۹۹ھ ہجری مطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ عیسوی روز سہ شنبہ وقت ظہر جناب مولانا مخدوم مکرم مولوی محمد نصراللہ خاں خلف محمد خاں صاحب، قوم افغان ساکن قصبہ خورجہ ضلع بلند شہر کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۶۸۔ بیاض جانثرا، ص ۲۹ تا ۴۶ نیز ص ۴۸، ۴۹۔
۶۹۔ بیاض جانثرا، ۶۸ تا ص ۱۲۱۔
۷۔ بیاض جانثرا، ص ۱۵۰ ومابعد، تاریخ وفات کے لیے کتاب مذکورہ ص ۱۶۸۔

جناب مولانا مرحوم اپنے محبوب سے وصل حاصل کر کے داخل جنت ہوئے کہ اس میں ہرگز شک نہیں ۔ پس اللہ تعالی اپنے فضل و کرم سے اور حبیب پاک کے صدقہ اور مولانا کے طفیل سے ۔جملہ مسلمانان نیز خاکسار کو ، وصل اپنا حاصل کرائے ، آمین ثم آمین ۔سکنائے شہر کو ان کے انتقال سے کمال درجہ رنج ہوا کہ جس کے بیان کے واسطے ایک دفتر چاہیئے۔ روز وفات جناب مولانا کے جنازہ کے ہمراہ اس قدر آدمی تھے اس وقت شمار کرنا دشوار ، مگر تخمینہ سے ہرگز ایک ہزار سے کم نہ تھے ۔ اور ہر ایک شخص کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے عزیزوں اور مریدوں سے یہ کہتے تھے کہ برائے خدا ہم کو تھوڑی دیر تک حضرت مولانا کے پایہ کو تھام کر چلنے دو ، اس وجہ سے کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے اور مولانا کی برکت سے ہمارے گناہ معاف کر دے۔" (۷۱)

شعراء اور متوسلین نے قطعات تاریخ کہے یہاں صرف علامہ شبلی کا عربی قطعہ نقل کیا جاتا ہے :

حین شدالرحل مولانا الاجل
ذاھبا تلقاء مولاہ الخفی
قدرثی الا فی ھجرانہ
راح نصراللہ خان احمدی (۷۲)

۱۲۹۹ھ

مولانا خویشگی مسلسل مصروفیات اور سرکاری ملازمتوں کے باوجود ہمیشہ اپنے معمولات کے پابند ، اصلاح و استفاضہ نیز درس میں مشغول رہے ، ایک جانب

۷۱ ۔ یہ یاد داشت مصطفی خاں صاحب کے نواسے میاں حافظ رشیق محمد خاں صاحب پرنسپل رفاہ عام انٹر کالج کے پاس محفوظ ہے ، موصوف نے یہ یاد داشت دکھائی اور اس کے متعلقہ صفحات کا فوٹو اسٹیٹ دے کر ممنون کیا۔

۷۲ ۔ بیاض جانفراز ص ۱۷۹۔

کچہری عدالت کا دربار لگتا سرکاری اور عوامی مسئلے حل کئے جاتے، دوسرے اوقات میں خود کسی استاد سے سبقا سبقا کوئی کتاب پڑھتے اپنے شاگردوں کو پڑھاتے نیز اپنے متوسلین و مریدین اور اہل ذوق وطلب کو ارشاد و تلقین سے نوازتے اور ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش فرماتے۔

مولانا کے شاگردوں کی خاصی تعداد ہے جس میں مولانا مفتی محمد ایوب (۷۳) پھلتی اور ڈپٹی نذیر احمد (۷۴) بطور خاص قابل ذکر ہیں مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں۔

"وکان عالماً کبیرا، بارعافی کثیر من العلوم والفنون، حریصا علی الدرس والافادة، اخذعنه خلق کثیر" (۷۵)

"اور بہت بڑے عالم تھے، بہت سے علوم وفنون میں ماہر تھے، درس و افادہ کے دلدادہ تھے، ان سے بڑی تعداد میں طلبا نے استفادہ کیا"

اور ان بے پناہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ روزانہ پابندی سے روزنامچہ لکھنے کا بھی معمول تھا۔ یہ روزنامچہ مولانا کے ذاتی حالات، دوستوں سے ملاقات و خط و کتابت اور اس وقت کی معلومات کا ذخیرہ اور برسہابرس کی یادداشتوں کا جامع ہے، اس کا ایک حصہ جو ۲۵ جولائی ۱۸۶۱ء سے ۲۸ جولائی ۱۸۶۹ء آٹھ سال کے اندراجات پر مشتمل

۷۳۔ نزہۃ الخواطر ص ۸۵ ج ۸۔ (حیدر آباد: ۱۴۰۲ / ۱۹۸۱ء) نیز در فرید ص ۷۲، مولانا محمد ایوب پھلتی کا لکھا ہوا خلاصۃ الحساب کا قلمی نسخہ راقم سطور کی نظر سے گذرا ہے اس کے آخر میں مولانا محمد ایوب کے یہ الفاظ درج ہیں۔

"کتاب خلاصۃ الحساب در علم حساب از دست ----- منسوب بہ عیوب محمد ایوب بن شیخ قمر الدین ساکن موضع پھلت بتاریخ یاز دہم ماہ ربیع الثانی روز چہار شنبہ وقت نماز عصر در سنہ ۱۲۶۴ بر مکان استادی و مولوی جناب مولوی نصر اللہ خاں صاحب خورجوی تمام شد۔"

۷۴۔ ڈپٹی نذیر احمد کے چند واقعات از ڈاکٹر محمد انصار اللہ مشمولہ ڈپٹی نذیر احمد نمبر، سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ (جون: ۱۹۹۴ء) ص ۷۰، ۸۰، نیز بیاض جانثر اء ص ۴۷۔

۷۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۱۵ (حیدر آباد: ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء)

ہے' ذاکر حسین لائبریری (جامعہ ملیہ' دہلی) میں محفوظ ہے (۷۶)۔

اس کے علاوہ مولفات کا مستقل سلسلہ تھا' جس میں زبان اور موضوعات دونوں کا تنوع رہتا تھا' اردو' فارسی' عربی اور ترکی وغیرہ متعدد زبانوں میں' مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں مرتب فرمائیں' مولوی فرید احمد غازی پوری نے مولانا کی انیس تالیفات کا ذکر کیا ہے (۷۷)۔ مگر یہ فہرست نا تمام ہے' اور بھی متعدد تصانیف ہیں جن کے نام اس فہرست میں شامل نہیں ہیں' مثلاً "رسالہ محیط الاوزان" نصر اللہ خوانی' ارشاد المجید فی اثبات التقلید' شرح خلاصہ کیدانی فارسی اور بیاض دلکشا ایسی کتابیں ہیں' جن کا محمد فرید غازی پوری اور ڈاکٹر محمد اسلم فرخی (۷۸) دنوں نے ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد تالیفات ہیں جن کے قلمی نسخے ہندو پاکستان کے علمی ذخیروں میں موجود ہیں۔ منجملہ ان کے رسالہ ضوابط مدرسہ دارالعلوم سرکاری (حیدر آباد۔ دکن (۷۹) ہے۔ ان سب کے تفصیلی تذکرہ کا یہاں موقع نہیں۔

مولانا خویشگی نے حیدر آباد کے زمانہ قیام میں طب یونانی اور ویدک کے ہندوستانی مفردات پر ایک نادر کتاب تذکرۃ الھند کا فارسی ترجمہ نہایت اہتمام سے تصحیح متن اور مختصر حواشی سے مزین کر کے شائع کیا تھا جو اپنی علمی فنی

۷۶۔ یہ روزنامچہ راقم سطور نے دیکھا ہے اس کا نام مولانا خویشگی نے جامع اللطائف رکھا تھا۔ نیز اس روزنامچہ کے تعارف کے لیے پروفیسر محمد اظہر انصاری کا مضمون ملاحظہ ہو "ایک فارسی روزنامچہ' ماہ نامہ جامعہ دہلی' اپریل ۱۹۷۵ء۔

۷۷۔ بیاض جانفزا' ص ۲۱۔

۷۸۔ ملاحظہ ہو مقدمہ گلشن ہمیشہ بہار' مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۵۔ ۲۶ (کراچی: ۱۹۶۷ء) تعجب ہے کہ ڈاکٹر فرخی نے مولانا خویشگی کے حالات و سوانح میں بیاض جانفزا' اور درفرید کے علاوہ اور کتابوں سے استفادہ کی زحمت نہیں کی ورنہ امید تھی کہ مولانا خویشگی کے متعلق بہت سی نادر معلومات اور ان کی متعدد نامعلوم تالیفات اور دیگر تفصیلات سامنے آتیں۔

۷۹۔ رسالہ ضوابط مدرسہ دارالعلوم سرکاری۔ تالیف مولانا نصر اللہ خاں خویشگی' مخزونہ لائبریری نیشنل میوزیم آف پاکستان' کراچی ۔۔۔ فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان' تالیف احمد منزوی ص ۲۳۷۸ ج ۴ (اسلام آباد: ۱۴۰۵ / ۱۹۸۵ء)

خصوصیات کے علاوہ حسن طباعت میں بھی ممتاز تھا (۸۰) ۔ مگر مذکورہ پچیس سے زائد تصنیفات میں سے بیاض دلکشا، تاریخ دکن اور گلشن ہمیشہ بہار بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہاں صرف بیاض دلکشا کا مختصر تعارف لکھا جاتا ہے ۔

تعارف بیاض دلکشا | بیاض دلکشا ۱۸ - ۲۷ سینٹی میٹر سائز کے دو سو چھپن صفحات پر مشتمل ہے آخر میں سترہ صفحات کی فہرست مضامین ہے ۔ گویا کل کتاب ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ بیاض دلکشا نہایت کم یاب ہے اس کے نسخے بہت کم دستیاب ہیں، ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے ۔

بیاض دلکشا کی طباعت، مطبع فتح الاخبار، کول، علی گڑھ سے عمل میں آئی جو مولانا خویشگی کا ذاتی پریس تھا (اس کو مولانا نے اپنے ماموں فتح علی خاں کی یاد میں قائم کیا تھا) بیاض دلکشا کے صفحہ اول پر پانچ سطروں میں یہ الفاظ درج ہیں:

"واللہ علیم بذات الصدور

الحمد للہ کہ این نسخہ مصنفہ مولانا عبدالعلیم نصر اللہ خاں مسمیٰ بہ

بیاض دلکشا

در فتح باغ، واقع سبز آباد عرف کول، علی گڑھ

بہ مطبع فتح الاخبار طبع شد"

بیاض دلکشا کا (جو حضرت شاہ احسان علی پٹنی اور شاہ عبدالعلیم لوہاروی کے حالات و کمالات پر مشتمل ہے) آغاز شاہ احسان علی کے تذکرہ سے ہوتا ہے ۔ اس کے بعد ص ۶۴ تک شاہ صاحب اور ان کے خلفاء کے واقعات درج کئے گئے ہیں بیچ بیچ میں اور بھی مختلف چیزیں آ گئی ہیں، ص ۶۷ سے آخر کتاب تک مولانا خویشگی کے پیر و مرشد شاہ عبدالعلیم کے احوال مذکور ہیں ۔ مگر اس میں مرتب واقعات اور تاریخی ترتیب پر عشق اور والہانہ پن غالب ہے ۔ ایک واقعہ لکھتے لکھتے کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں ۔ مگر اس بے ترتیبی میں بھی ایک لطف ہے، جو شاید

---

۸۰ - تذکرۃ الہند کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں تھا مگر اس بڑے سائز کی تقریباً چھ سو صفحہ کی ضخیم کتاب کو دیمک نے اس طرح چاٹا کہ ایک ورق بھی باقی نہیں رہا ۔

مرتب سوانح میں نہ ہوتا ۔

بیاض دلکشا کا سنہ تالیف محقق نہیں ، کتاب میں ایسی کوئی اطلاع موجود نہیں جس سے اس کا سنہ متعین کیا جاسکے ۔ مگر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ کتاب مولانا عبدالعلیم لوہاروی کی وفات کے فوراً بعد لکھی گئی ہے ۔ مولانا کی اکثر کتابیں تالیف کے فوراً بعد چھپی ہیں اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ کتاب تالیف کے قریبی دور میں ۱۲۷۰ء (۵۲ - ۱۸۵۲ء) کے آس پاس چھپی ہو ۔ اس کا ایک اور قرینہ یہ ہے کہ مولانا خویشگی کا تذکرۂ شعراء "گلشن ہمیشہ بہار (۸۱) اسی مطبع سے رجب ۱۲۷۰ھ (اپریل ۱۸۵۴ء) میں پہلی مرتبہ چھپا تھا اور بیاض دلکشا کی کتابت ، سائز اور طباعت اسی طرح کی ہے جیسی گلشن بہار کی ، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں تقریباً ایک ہی دور میں شائع ہوئی ہیں ۔

متعلقہ معلومات کے بعد اب اصل مکتوبات کا مطالعہ مناسب ہے یہ

مکتوب اول حضرت میاجیو نور محمد

"بعد حمد ایزد پاک و درود صاحب لولاک

بخدمت بابرکت مولوی صاحب معظم و مکرم ، منبع عنایات و اخلاق مجسم ، مووی نصر اللہ خاں صاحب دامت برکاتہ ، بعد از تبلیغ ہدیہ سلام مسنون الاسلام ، و دعائے خیریت التیام ، و اشواق مواصلت مباہجت انضمام ، مشہود رائے محبت ، اقتضا آنکہ

بورود سامی نامہ مسرت پیرای و منبسط بودہ ، مطلع بر کوائف مندرجہ شدم ۔ آز آنجا کہ عزیز عبدالعزیز متلاشی روزگار واہی کہ باں ضرر ایمان باشد بود ، طبعم ازاں

۸۱ ۔ گلشن ہمیشہ بہار کی پہلی طباعت کم یاب سمجھی جاتی ہے ، اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہے ، ہمیشہ بہار کا دوسرا ایڈیشن جس میں ڈاکٹر اسلم فرخی کے مختصر مقدمہ کے علاوہ حواشی یا تحقیق نہیں ہے کراچی سے سنہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا ۔

متنفر می ماند، می خواستم کہ بخدمت کسے صاحب اسلام بودہ، طبق و سبق ہر دو بدست آرد۔ الحمد للہ علی ثانہ کہ مافی ضمیرم بظہور رسید، اکنوں حسب ایمائے سامی بروایت صداقت نشان سید نیاز علی صاحب واسترضائے داعی خیر، مشرف می گردد۔ طور یکہ بخوبی و مناسب باشد بعمل آرند، بالجملہ درماندنش بخدمت بابرکت، موجب خیر و برکت دارین است، زیادہ ازین چہ گذارش زود

از جانب سید نیاز علی و مولوی صاحب و میاں محمد عارف و سعد اللہ خاں بعد سلام آنکہ، آرزو داریم کہ بطریق ملاقات برائے شبے، رونق بخش اینجا شوند، بموجب آن کہ الکریم اذا وعد وفیٰ والسلام مع الاکرام

الراقم نور محمد ________" (۸۲)

ترجمہ : خدائے پاک کی حمد، اور صاحب لولاک علیہ الصلوۃ و السلام پر درود کے بعد :

مولوی صاحب معظم و مکرم، عنایات کا سرچشمہ اور اخلاق مجسم مولوی نصر اللہ خاں صاحب دامت برکاتہ کی خدمت بابرکت میں سلام مسنون کا ہدیہ پہنچانے، خیریت تام کی دعا اور مسرتوں سے پرشوق ملاقات کی تمنا کے بعد، محبت آشنا دل گرامی نامہ ملنے سے نہایت خوش ہوا اور کھل گیا۔

مندرجہ احوال کا علم ہوا، اس جگہ سے جہاں عزیز عبدالعزیز ایسے برے ذریعہ معاش کی تلاش میں ہے کہ جس سے ایمان کا نقصان ہے میری طبعیت نفرت کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کسی ایسے صاحب ایمان کے پاس رہے جس سے معاشی اور علمی دونوں طرح کے فائدے حاصل ہوں، اللہ تعالے کا شکر ہے کہ جو بات میرے دل میں تھی وہی عمل میں آئی، اس وقت آنجناب کے اشارے سے سید نیاز علی صاحب کی روایت کے مطابق (معاش کی ایک) اچھی صورت کے لیے آن مکرم کی رضا مندی کی خبر سے مشرف ہوا، جس صورت سے بھی بہتر اور مناسب ہو کریں، بہرصورت آپ کی خدمت میں رہنا دنیا اور آخرت کی بھلائی لازم کرنے

---

۸۲ - بیاض دلکشا ۱۵۳، ۱۵۴ -

والا ہے، اس کے علاوہ اور کیا گذارش کروں۔

سید نیاز علی، مولوی صاحب، میاں محمد عارف اور سعد اللہ کی جانب سے سلام مسنون کے بعد، ہماری یہ تمنا ہے کہ ایک رات کے لیے ٹھہرنے کے ارادہ سے تشریف فرما ہوں، کیونکہ کریم جب وعدہ کرلیتا ہے تو اس کو پورا بھی کرتا ہے۔ والسلام مع الاکرام۔

الراقم نور محمد

مکتوب دوم میانجیو نور محمد بنام مولانا خویشگی

الحمد للہ والصلوۃ علی رسول اللہ،

بلبل دلم بگوید ہردم ہمیں ترانہ
در گلشن محبت یک نکتہ عاشقانہ
خوش زندگی کسے را در گلبن دو عالم
رنگ و بہار دارد در حب آں یگانہ

گلشن اوقات آں منبع الحسنات و البرکات پیوستہ از سموم کشاکش کائنات مصئون بودہ، بہ ترشح مطر یاد الٰہی مطر آباد۔

پس از ترسیل تحیہ سنیہ، گلدستہ سلام کہ فاتحہ کلام وابستگان سلسلہ اسلام است، میر بن ضمیر خلت تخمیر می نماید، ہر چند کہ عندلیب دل داعی بہ تمنائے گل دیدار گرامی بگلبن وجود ترانہ سازد، لیکن سر رشتہ این کار بدست مختار، بناء علیہ آں را بہ آمد آمد ربیع ہنگامہ خوش گذاشتہ، شاہد مدعا را بمنصہ اعلان جلوہ ظہور می دہد، کہ بہ زمان میمون بہ مشاہدہ بر آں بہار مضامین نگارین نامہ مباہجت آگین چشم و قلب طراوت نضارت بے اندازہ گرفت۔ ع

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

آنچہ دربارہ روا داشتن این کار در حق عبدالعزیز باوصف چنین نسبت و ملازمت زیب تسطیر پذیرفت، الحق لاریب فیہ "مشفقا اختیار این مکارہ را از رہگذر عدم تیسیر قوت لایموت، متعلقانش کہ بے جائیداد محض اند، تصور فرمایند، درین محل چہ از اقاصی وچہ از ادانی، ہمہ سپر انداز ند اگر ذات بابرکات را دراں مقام از وے چیزے حاصل نہ

شد، اما دریں دار ناپائدار از مثوبات عظیم و مزدات جسیم عاید گردید، جزاکم اللہ فی الدارین خیرا

و کسے صاحب ہداہ اللہ تعالیٰ، از جانب داعی، پیش سامی نمود بحق عزیز مذکور، آں افتراء محض است معاذ اللہ تعالیٰ من جمیع الاہوال و والآفات، برائے تفریق و امتیاز صدق و کذب این معنی ذات گرامی را حکم گردانیدم بامعان نظر غور فرمودہ منصفی فرمائند، واز عزیز مسطور کہ تنزل محبت گردید، این راعین محبت و شفقت سامی درحق وے تصوریدم باین کہ عتاب پیران، رہنمائے برائے خورداں و سالکاں معروف، وآں کہ در بعضے مقدمات مخاطب بداعی خیر شدند، آں را یکے از حسن اخلاق و خوش مزاجی سامی دانستہ، بسیار خوش دل و منشرح الخاطر گشتم۔

مگر آرے اگر دراں باب، طاقت و یارائے آں داشتے، ہیچ کس را از محارم و غیر محارم خودرا، محروم نہ گذاشتے، کلید فتح باب آں، بدست دیگر است، لیکن حیرانم کہ ایں کس دراں باب گاہے سوائے تلقین علم ظاہری، عزیز مذکورہ را تحریر آو تقریر آو وقولا و فعلا و ایماء داعی و متصدع بہ چیزے بہ خدمت سامی نہ شدہ بہ چہ نوع قلم انداز این متشابہات بہ من گردیدند۔ اللہ یفعل مایشاء و یحکم مایرید۔

و در وادی نسبت عزیز مذکور کہ مرتسم شدند، بہ مصداق قول سامی گاہے اورا قابل ایں کار نیافتم، بموجب آنکہ:

منزل عشقت مکانے دیگر است
مرد ایں رہ را نشانے دیگر است
کشتگان خنجر تسلیم ___ را
ہر کماں از غیب جانے دیگر است

والسلام، اللہ معکم اینما کنتم

از مولوی صاحب و محمد عارف و دیگر صاحبان سلام پذیراباد، فقط الراقم نور محمد عفی اللہ عنہ۔ (۸۳)

۸۳۔ بیاض دلکشا ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶۔

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور درود و سلام ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

بلبل ہر وقت میرے دل میں یہی ترانہ گاتی ہے
کہ گلشن محبت میں ایک عاشقانہ نکتہ کافی ہے
دنیا کے گلستاں میں کسی شخص کی اچھی زندگی
اس ذات واحد کی محبت سے رنگ اور بہار پر آتی ہے

اچھائیوں اور برکتوں کے مجموعے، آپ کے محبت کے شب و روز کا چمن، دنیا کی زہریلی ہواؤں کے اثر سے پاک اور محفوظ اور یاد الٰہی کی پھوار سے ترو تازہ رہے۔

سلام مسنون کا تحفہ پہونچنے کے بعد، جو مسلمانوں کے لیے بات چیت کے افتتاح کا ذریعہ ہے دوستوں کی محبت سے گندھے ہوئے دل کو معلوم ہو کہ اگرچہ دل میں جناب والا کے دیکھنے اور ملاقات کا بے حد تقاضا ہے، لیکن اس کام کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ اس وجہ سے اس کو موسم ربیع کے آنے تک ملتوی کرکے اپنے ارادہ (اور آنے کے وقت) سے مطلع کریں، تاکہ اس پرمسرت وقت کے آنے تک پر بہار مضامین سے آراستہ گرامی نامہ کے مطالعہ و دید سے دل اور آنکھوں کو تازگی و ٹھنڈک اور بے پناہ آسودگی حاصل ہو۔

تیرے اوقات خوش خرم رہیں کہ تونے ہمیں خوش کر دیا۔

اور عزیز عبدالعزیز کے لیے اس ملازمت کو صحیح سمجھنے، اور ان کے لیے اس رابطہ کی نسبت سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے بلاشبہ صحیح ہے۔

میرے مشفق! اس ناگوار بات کو، اس کے اور ان کے متعلقین کے لیے زندہ رہنے کے لیے ضروری وسائل بھی موجود نہ ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا۔ کیونکہ ان کے پاس مطلق کوئی جائیداد نہیں ہے، اس موقع پر کیا اعلیٰ کیا ادنیٰ سب سپر ڈال دیتے ہیں، اگرچہ جناب عالی کو اس جگہ پر اس سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہو لیکن اس دنیا میں بڑا بدلہ اور بڑی خوش خبریاں حاصل ہوں گی، اللہ تعالےٰ آپ کو دونوں جہاں میں بہترین جزا عطا فرمائے۔

کسی شخص نے (اللہ ان کو ہدایت دے) آں جناب کو میری جانب سے

عزیزم عبدالعزیز سے رابطہ منقطع کرنے کی بات کہی ہے وہ محض افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام آفتوں، مصیبتوں سے پناہ میں رکھے۔ اس معاملہ کے جھوٹ سچ کی پہچان کے لیے جناب والا کو فیصل مقرر کر رہا ہوں، خوب گہرائی سے غور فرما کر فیصلہ فرمائیں نیز عزیز مذکور سے جو بے التفاتی کا معاملہ فرمایا اس کو اس کے حق میں جناب کی خاص شفقت و عنایت سمجھتا ہوں، یہ سمجھتے ہوئے کہ بڑوں اور پیروں کا غصہ اور ناگواری بھی چھوٹوں اور زیر تربیت افراد کے لیے رہنما اور مفید ہوتی ہے۔

اور یہ کہ بعض معاملات میں مجھے مخاطب بنایا اس کو جناب کا حسن اخلاق اور خوش مزاجی سمجھ کر بے حد دل خوش ہوا ہے اور طبیعت کھل گئی ہے۔

مکرر یہ کہ اگر اس میں میرا ذاتی اختیار ہوتا اور میں اس کی صلاحیت رکھتا تو اپنے رشتہ داروں اور اجنبیوں میں سے کسی کو بھی محروم و بے فیض نہ چھوڑتا، مگر اس دروازہ کا کھلنا دوسرے (حق تعالیٰ) کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن میں حیران ہوں کہ میں نے کبھی بھی سوائے عزیز مذکور کے لیے علم ظاہری کی تلقین کے، تحریر و تقریر سے یا زبان سے یا عمل سے، یا اشارہ کنایہ سے بھی، جناب والا کی خدمت میں کسی چیز کی گذارش نہیں کی۔ پھر کیوں اس قسم کے مبہم اشارات مجھ سے کئے گئے ہیں۔ خیر! اللہ جو چاہے کرتا ہے اور جس چیز کا چاہے حکم فرماتا ہے۔

اور عزیز مذکور کے معاملہ میں جو کچھ بھی لکھا گیا، جناب کے قول کے مطابق کبھی اس کو اس کام کے لائق نہیں سمجھا۔

منزل عشقت مکانے دیگر است
مرد این رہ دانشانے دیگر است
کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اللہ آپ کے ساتھ ہو جہاں بھی آپ ہوں۔
الراقم نور محمد۔

(مکتوب سوم حضرت میانجیو نور محمد بنام برادر زادۂ خود میاں عبدالعزیز)

برخوردار اقبال نشاں میاں عبدالعزیز، ہموارہ بعافیت باشند، از نور محمد، پس از سلام مسنون و دعا خیریت مقرون و حصول و خیریت جانبین، مطالعہ نمایند، کہ بوصول خط مرسلہ ایشاں خاطر را کمال راحت و فرحت گردید، باید کہ ہم بریں غط حالات و خیریت خود دائمای نوشتہ باشند کہ طمانیت بآں، متصور، و بخانہ، ایشان خیر و عافیت است مطمئن خاطر باشند۔

دیگر آں کہ تابعداری مولوی صاحب بہر صورت می کروہ باشند، نوعے قاصر نہ شوند، واز نوشت و خواند غافل نہ باشند، از جمیع طفلان مکتب سلام قبول باد (۸۴)۔

ترجمہ: برخوردار اقبال نشان میاں عبدالعزیز، تم عافیت کے ساتھ ہو۔

نور محمد کی جانب سے سلام مسنون اور خیریت کی دعا اور دونوں طرف سے خیریت کی اطلاع کے بعد معلوم ہو کہ تمہارے بھیجے ہوئے خط پاکر طبعیت کو بے انتہا فرحت اور خوشی حاصل ہوئی، چاہیئے، کہ اسی طرح اپنے حالات اور خیریت ہمیشہ لکھتے رہو۔ کیونکہ اس سے اطمینان متوقع ہے۔

تمہارے گھر خیر و عافیت ہے: دل مطمئن رکھو اور ہر صورت میں مولوی صاحب کی اطاعت کرو، کسی طرح کوتاہی نہ ہو، اور لکھنے پڑھنے سے غافل نہ رہو۔ مکتب کے سب بچوں کی طرف سے سلام قبول ہو۔

۸۴۔ بیاض دلکشا ۱۵۶، ۱۵۷۔

مولوی محمد جعفر تھانیسریؒ

ایک مختصر تعارف

پروفیسر نثار احمد فاروقی
صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تھانیسر ہریانہ کا بہت قدیم اور تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ ہماری تاریخ، تہذیب و ثقافت، فنون لطیفہ، شعر و ادب اور مذہب و تصوف، ہر میدان میں اس شہر نے بیش بہا ورثہ دیا ہے ایک طرف یہ ہندوؤں کا نہایت مقدس تیرتھ استھان ہے تو دوسری طرف کتنے ہی جلیل القدر مسلمان صوفیہ اس سر زمین سے اٹھے ہیں جنھوں نے روحانیت کا اجالا ہندوستان ہی میں نہیں، باہر دور، دراز ملکوں تک پھیلایا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین بلخی اور حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری چشتی صابری سلسلے کے صوفیہ میں نہایت ممتاز ہیں۔ اسی طرح اردو اور فارسی کے باکمال اساتذہ اور شعراء تھانیسر نے دیے ہیں۔ فارسی شاعروں میں نسبتی تھانیسری کا خاص مرتبہ ہے یہ ہندی بھاشا کا شاعر تھا، فارسی میں اس کا تخلص نسبتی تھا تو بھاشا میں نس پتی (निसपति) لکھتا تھا۔

اسی تھانیسر نے فیصلہ کن جنگیں بھی دیکھی ہیں اور حملہ آور دشمنوں کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کیا ہے۔ صرف پرانی تاریخ ہی میں نہیں، آج سے سو سال پہلے تک کی تاریخ نہایت جری، جیالے اور جاں باز سپاہی تھانیسر میں پیدا ہوئے ہیں جن کی بے مثال قربانیوں کی بدولت آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ آج

کی صحبت میں ایک ایسے ہی مجاہد آزادی کی داستان حیات سے کچھ جھلکیاں دیکھتے ہیں اس سے اندازہ ہو گا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے وطن عزیز کو ظلم واستبداد کے پنجوں سے چھڑانے کے لیے کیسی قربانیاں دی تھیں اور کیا کیا پاپڑ بیلے تھے

شاید نئی نسل کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ تھانیسر کو اب کوروکشیتر کہا جاتا ہے۔ آج بھی گذری ہوئی صدیوں کی تاریخ کے اوراق یہاں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں انھیں غور سے دیکھیں تو کسی ورق پر ایک نام مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بھی نظر آجائے گا۔

مولوی محمد جعفر ارائین قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد کا نام میاں جیون تھا۔ محمد جعفر ۱۸۲۷ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ بچپن سے نہایت ذہین، محنتی اور بلند حوصلہ تھے۔ مالی اعتبار سے بھی ان کا خاندان خوش حال تھا، کچھ زمینداری تھی، تجارت بھی کرتے تھے اور تھانیسر کی کچہری میں عرائض نویسی اور اسامپ فروشی کا کام بھی شروع کر رکھا تھا، کچھ ہی دنوں میں قانون کی ایسی واقفیت پیدا کر لی تھی کہ پیچیدہ قانونی معاملات میں لوگ ان سے صلاح لیا کرتے تھے۔ ابھی اٹھتی جوانی تھی، امنگوں اور مرادوں کے دن تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ان کے دل میں شروع ہی سے آزادی کی تڑپ بھری ہوئی تھی، چند ساتھیوں کو لے کر دہلی کی طرف گئے اور جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد انگریزوں نے دہلی کو فتح کر لیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی تو محمد جعفر دہلی سے فرار ہو کر تھانیسر واپس آگئے اور بہ ظاہر اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے مگر دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکومت نے جو مظالم کئے تھے انھیں دیکھ کر خون کے گھونٹ پی رہے تھے۔ ادھر سرحد کے علاقے میں مجاہدوں نے انگریز حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی، محمد جعفر تھانیسری نے ان جاں باز سپاہیوں سے رابطہ پیدا کر لیا اور جس طرح ممکن ہوا ان کی امداد کرتے رہے۔ ۱۸۶۳ء کے آخر میں بونیر اور اس کے نواحی علاقوں میں انگریزوں سے متعدد جھڑپیں ہوئیں، ایک معرکے میں تو جنرل چیمبرلین بری طرح زخمی ہوا اور میجر گاروو ک (Garvock) کو سپہ سالار بنا کر میدان سے ہٹ

گیا تھا یہ معرکے جنگ امبیلا کہلاتے ہیں۔ ان میں چار سو سے زیادہ مجاہدین آزادی شہید ہوئے، انگریزوں کی فوج سات ہزار تھی۔ مجاہدین کو رائفلیں اور سامان رسد یا نقدی بھجوانے کا کام محمد جعفر تھانیسری کرتے تھے۔ انھیں "خلیفہ" کہا جاتا تھا اور ان کا دوسرا نام "پیرو خاں" بھی تھا۔ غزن خاں نامی ایک غدار نے کسی طرح اس تنظیم کا پتا لگا کر ڈپٹی کمشنر کرنال کو مخبری کر دی کہ "محمد جعفر نمبر دار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔" محمد جعفر کے ایک دوست نے اپنے ملازم قادا سے اظہار افسوس کے طور پر کہا کہ محمد جعفر کے خلاف مخبری ہو گئی ہے وہ محمد جعفر کو خبردار کرنے کے لیے فوراً کرنال سے تھانیسری کی طرف روانہ ہو گیا مگر وہاں رات گئے پہنچا اور یہ سوچا کہ صبح سویرے انھیں بتادوں گا، صبح ہونے سے پہلے ہی انگریز کپتان پارسنز تلاشی کے وارنٹ لے کر پہنچ گیا۔ سونے سے پہلے محمد جعفر ایک خط رمزیہ زبان میں محمد شفیع ٹھیکہ دار انبالہ کو لکھ چکے تھے جس میں مجاہدوں کو روپیہ بھجنے کی بات کی گئی تھی، وہ ان کے کمرے سے مل گیا مگر خود محمد جعفر کسی طرح نکل بھاگے۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو وہ پیپلی گئے، وہاں سے انبالہ آئے، پانی پت ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، یہاں سے شکرم میں بیٹھ کر علی گڑھ چلے گئے۔ کپتان پارسنز نے محمد جعفر کے بھائی محمد سعید کو مار پیٹ کر سب سراغ حاصل کر لیے اور یہ علی گڑھ سے گرفتار ہوئے۔

اب انگریزوں نے محمد جعفر کو ایک تنگ اور تاریک کوٹھری میں رکھا، کھانے کو دو روٹیاں جس میں آٹے کے ساتھ ریت بھی ملا ہوتا تھا اور ساگ کے ابلے ہوئے ڈنٹھل ملتے تھے۔ پانوں میں بیڑیاں پڑی تھیں، گلے میں ایک بھاری لوہے کا طوق ڈال دیا تھا۔ ان سے مجاہدوں کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے نہایت بے رحمی کے ساتھ مارا جاتا تھا مار کھاتے کھاتے بیہوش ہو جاتے تھے، کبھی ساری رات مار کھاتے گذر جاتی تھی۔

دوسرے مجاہدوں کے ساتھ مولوی محمد جعفر تھانیسری پر بھی بغاوت کا مقدمہ چلا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ ان کے بھائی محمد سعید کو سخت سزائیں دے کو سرکاری گواہ بنا لیا گیا تھا۔ دوسرے ملزموں نے تو اپنی صفائی

کے لیے۔ بھاری محنتانے پر انگریز وکیلوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں مگر مولوی محمد جعفر نے اپنے مقدمہ کی خود ہی پیروی کی ۔مقدمہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت دائر ہوا تھا۔ یہ ہربرٹ ایڈورڈز Herbert Edwards کی عدالت میں تھا، اس نے ۱۰۵ صفحات پر فیصلہ لکھا۔ دکھاوے کے لیے چار اسیسر بھی مقرر تھے جن میں دو ہندو اور دو مسلمان تھے، انھوں نے بھی حکومت برطانیہ کی وفاداری میں وہی کہا جو Edwards چاہتا تھا۔ فیصلہ میں گیارہ ملزموں میں سے تین کو پھانسی اور کل جایداد ضبط کرنے کا حکم ہوا اور آٹھ ملزموں کو جایداد ضبط کرکے کالاپانی بھیجنے کی سزا تجویز کی گئی۔

مولوی محمد جعفر ان تین ملزموں میں سے ایک تھے جن کی ساری منقولہ وغیر منقولہ جایداد ضبط ہوئی اور پھانسی پر لٹکانے کا حکم ہوا۔ یہ فیصلہ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو سنایا گیا۔ اس کی اپیل جوڈیشل کمشنر پنجاب Roberts کی عدالت میں کی گئی۔ اس نے تینوں ملزموں کی سزائے موت کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا۔ یہ ازراہ ترحم نہ تھا بلکہ اس نے فیصلے میں لکھا کہ پھانسی کے مقابلے میں یہ سزا زیادہ سخت ہوگی۔ ان کی کل املاک ضبط ہوں اور قید کے زمانے میں کوئی معافی نہ ہو۔ اس اپیل کا فیصلہ ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو سنایا گیا مولوی محمد جعفر نے اپنی کتاب "کالاپانی" میں لکھا ہے:

"جس روز سزا کا حکم سنایا جانے والا تھا ہربرٹ ایڈورڈز Herbert Edwads نے میری طرف مخاطب ہوکر کہا کہ تم بہت عقل مند، ذی علم اور قانون داں ہو۔ اپنے شہر کے نمبر دار اور رئیس ہو، لیکن تم نے اپنی ساری عقل مندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا اب تمھیں پھانسی دی جائے گی۔ جایداد ضبط ہوگی، تمھاری لاش بھی تمھارے وارثوں کو نہ ملے گی اور تمھیں پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میں نے جواب دیا: جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے آپ کو ہلاک کر دے۔ اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا مگر پھانسی کا حکم دینے سے

زیادہ میرا کیا کر سکتا تھا۔"
مولوی محمد جعفر تو برسوں زندہ رہے ایڈورڈز دسمبر ۱۸۶۸ء میں مر گیا۔

جس دن پھانسی کا حکم سنایا گیا، مولوی محمد جعفر ایسے خوش تھے گویا عید ہو گئی۔ کپتان پارسنز نے پوچھا کہ تم اتنے خوش کیوں ہو؟ محمد جعفر نے کہا کہ "شہادت کی امید پر۔ تم اسے کیا سمجھ سکتے ہو"۔

ان جانبازوں کو پھانسی کی کوٹھریوں میں رکھا گیا۔ ان پر عموماً ھندو یا سکھ سپاہی پہرہ دیتے تھے۔ آزادی کے ان متوالوں کی حالت دیکھ کر وہ بھی رونے لگتے تھے۔ ایک بار ان سپاہیوں نے آپس میں صلاح کر کے ان سے کہا کہ آپ جیل سے فرار ہو جائیں، ہم پر ڈیوٹی میں غفلت کا مقدمہ چلے گا اس کی سزا ہم بھگت لیں گے مگر آپ کی جان تو بچ جائے گی۔ مولوی محمد جعفر اور ان کے ساتھیوں نے اس ہمدردی کا شکریہ ادا کیا کہا کہ ہم بھاگ کر بزدلی نہیں دکھائیں گے خدا اگر آزادی دے گا تو چھوٹ جائیں گے۔

بعض مجاہدین مثلاً قاضی میاں جان قید میں ہی مر گئے، مولوی محمد جعفر تھانیسر کی ماں کا انتقال ہو گیا یہ ان کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ ساری جایداد ضبط ہونے کے بعد ان کا آخری زمانہ بڑی کس مپرسی میں گذرا مگر اس اللہ کی بندی نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ان قیدیوں کو سخت مشقت کے کام دیے گئے۔ مولانا یحییٰ علی رہٹ کھینچتے تھے۔ مولوی محمد جعفر کو کاغذ کوٹنے کے کام پر لگایا تھا، یہ وہ کاغذات تھے جو سیکڑوں گھروں سے تلاشی کے دوران ضبط کیے گئے تھے۔ اب مولوی محمد جعفر کو انبالہ جیل سے لدھیانہ، پھلور، جالندھر، امرتسر کے راستے سے لاہور تک پیدل لایا گیا۔ بیڑیاں پیروں میں اور ہتھکڑیاں ہاتھوں میں پڑی رہیں۔ لاہور سے ریل میں ملتان، اور ملتان سے کشتی میں بیٹھ کر کوٹری آئے۔ یہاں سے ریل میں کراچی اور وہاں سے بمبئی لائے گئے۔ ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو جمنا نامی جہاز میں سوار ہوئے۔ ۳۴ دن سمندر میں سفر کر کے ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو پورٹ بلیر (انڈمان) پہنچے۔

جزائر انڈمان نکوبار جنھیں کالاپانی بھی کہا جاتا ہے کلکتہ سے ۸۰۰ میل

جنوب میں اور مدراس سے سات سو چالیس میل مشرق میں ۴۶ء۱ مربع میل علاقے تقریباً ایک ہزار جزیروں پر مشتمل ہے ان میں پانچ جزیرے بڑے ہیں باقی چھوٹے چھوٹے ہیں ۔ ان میں گھنے جنگل اور پہاڑیاں ہیں قدیم آبادی وحشی انسانوں کی تھی ۱۷۸۹ء میں انگریزوں نے اسے قیدیوں کی نوآبادی کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تھا ۔ مگر آب و ہوا خراب اور ضروری وسائل ناپید دیکھ کر ۱۷۹۶ء میں اسے ترک کر دیا تھا ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پھر انگریزوں نے ضرورت محسوس کی کہ جنگ آزادی کے ہزاروں جانباز سورماؤں کو ہندوستان کی عام جیلوں سے دور رکھا جائے تاکہ وہ بغاوت کے جراثیم نہ پھیلا سکیں ۔ یہاں زیادہ تر سیاسی قیدیوں کو بھیجا گیا ۔ ۱۸۶۱ء میں تقریباً ایک ہزار قیدی جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں حصہ لیا تھا رہا کر دیے گئے تھے ۔ اپریل ۱۸۷۹ء میں یہاں ۱۸۵۸ قیدی موجود تھے جن کا گوشوارہ تاریخ عجیب میں دیا گیا ہے انگریز حکومت نے یہاں بھی امتیاز رکھا تھا ہندوستانی قیدیوں سے سخت مشقت لی جاتی تھی اور نہایت معمولی کھانا کپڑا ملتا تھا، مگر عیسائی قیدیوں کو بہت سی رعایتیں حاصل تھیں ۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اپنی قابلیت ، ذہانت ، ملکی قوانین سے گہری واقفیت اور پندرہ سولہ زبانوں میں مہارت کی وجہ سے بہت مراعات حاصل کر لی تھیں ۔ انھوں نے کالاپانی آنے سے پہلے ۱۶ جون ۱۸۶۲ء سے اپنے حالات اور جنگ آزادی میں اپنی خدمات کا بیان لکھنا شروع کر دیا تھا، مگر ان کی گرفتاری کے وقت وہ مسودات بھی ضبط ہوئے ، پھر مقدمہ انبالہ میں بطور ثبوت پیش ہوئے ۔ آخر ضائع ہو گئے ۔ جزائر انڈمان میں آکر انھوں نے سب سے پہلے ان جزائر کی تاریخ لکھی ، یہ اس موضوع پر اردو زبان میں اکلوتی کتاب ہے "تاریخ عجیب" اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) برآمد ہوتے ہیں ۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۹۲ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپی تھی ، اب بہت کمیاب ہے ۔ اس میں جزائر انڈومان نکوبار اور وہاں کے آدی باسیوں کے بارے میں بہت مفید معلومات ملتی ہیں اس کے علاوہ محمد جعفر تھانیسری نے وہاں مختلف زبانیں بولنے والے قیدیوں سے ان کی زبانیں بھی سیکھیں اور روزمرہ کام آنے والے مکالمے

ان کی زبان میں لکھے ہیں - ان میں عربی، فارسی، ترکی، سواحلی، پشتو، مکرانی، سندھی، نیپالی، نکوباری، مرہٹی، بنگالی، تامل، گونڈی، بلوچی، پنجابی، کشمیری، سنتھالی، آسامی، برہمی، چینی، بندیل کھنڈی، مارواڑی، اوڑیا، تلنگی، گجراتی، کنڑ، ملیالم، سنگالی، بوجنگی جیدا، زبانوں کے نمونے درج کیے ہیں، نکوباری زبان میں چمن خاں کی لکھی ہوئی خالق باری کے انداز کی ایک نظم کے (۳۰) اشعار بھی دیے ہیں - یہ بڑی نادر چیز ہے - اس کا ایک شعر سینیے :

پیٹے پیٹے - تم صبر کرو
دیکھو دیکھو - ہرو ہرو

دوسری کتاب تواریخ عجیب عرف کالاپانی انھوں نے ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں لکھی اس میں انھوں نے اپنے مقدمہ بغاوت اور پھر قید و بند کے مفصل حالات لکھے ہیں -

مولوی محمد جعفر چیف کمشنر کی کچھری میں نائب میر منشی ہو گئے تھے، اس کی تن خواہ ملتی تھی - کچھ تجارت بھی کر لیتے تھے اور واحد ہندوستانی تھے جو انگریزی زبان جانتے تھے اس لیے قیدیوں کی عرضیاں وغیرہ معاوضہ لے کر لکھتے تھے اس طرح ان کی مالی حالت اچھی ہو گئی تھی -

انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو تھانیسر سے بلانے کی کوشش کی مگر اس کی اجازت نہیں ملی تو ایک کشمیری خاتون سے نکاح کر لیا یہ بیوی ۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو فوت ہو گئی تو تیسرا نکاح الموڑہ کی ایک خاتون سے کیا جو وہاں قتل کے الزام میں سزا بھگت رہی تھی - اس سے محمد جعفر کی آٹھ اولادیں پیدا ہوئیں - وہ یہاں سے تنہا کالے پانی گئے تھے - مگر جب ۱۷ سال ۹ ماہ کی قید کاٹ کر ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے نقد ان کے ساتھ تھے - ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو تھانیسر سے فرار ہوئے تھے، بیس برس کے بعد نومبر ۱۸۸۳ء کو پھر وطن عزیز میں واپسی نصیب ہوئی -

انبالہ چھاونی میں کپتان ٹمپل مولوی محمد جعفر کا شاگرد رہ چکا تھا اس نے

اپنی کچہری میں انھیں ملازم رکھ لیا۔ کچھ دنوں تک ان کی نگرانی ہوتی رہی، فروری ۱۸۸۸ء میں نگرانی ختم ہوگئی۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے ہندو مسلمان سب ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں کورو کشیتر ہی میں انتقال ہوا۔

ان کی اولاد میں مولوی محمد اسمعیل انبالہ میں وکالت کرتے تھے وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں شہید کر دیے گئے۔ باقی اولاد کا کچھ پتا نہ چل سکا (۱)۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

۱۔ محمد اسماعیل کے صاحبزادے اکتوبر ۱۹۶۱ء تک لاہور کے کسی سرکاری محکمہ میں ملازم تھے۔ مکتوب غلام رسول مہر بنام ایوب قادری مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء مندرجہ تواریخ عجیب یعنی کالاپانی مرتبہ ایوب قادری کراچی: ۱۹۶۲ء (نور)

علاج توازن کا متقاضی ہے - اسلیے اس کا اثر نہ صرف ہے بلکہ مقویات اعصاب، مفرحات [illegible]
اور مصلحات مخصوص ادویہ دی جاتی ہیں - [illegible] [illegible] ہضم [illegible] مرض
تو زور دیا جائے اصلاح ہضم پر، اور رعایت مرکوز رہے تقویت قلب و [illegible]
دماغ و اعصاب کی - اس کے برعکس اگر اسہال [illegible] قلب و دماغ ماؤف ہو
تو زور دیا جائے مفرحات و مقویات پر اور رعایت ملحوظ رکھی جائے آلات [illegible]
کی - گویا عرضی و مرضی کا فرق - بالاصل و بالعرض کی تفریق -

اصولی طور پر اس تعین تجویز کے بعد سوال پیدا ہوگا تعین ادویہ
اسمیں حذاق اطبا مختلف ہو سکتے ہیں - اہم مرکبات کیلئے ادب طبی [illegible]
مناسب ہوگا اور نگرانی [illegible] مستند۔

سید منزل لکھنؤ ۲ محرم ۹۲ [illegible]

جب ایمان کارفرما ہوتا ہے

(حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کا ایک روح پرور واقعہ)

از: نورالحسن راشد کاندھلوی

بزرگانِ دین کے حالات وواقعات میں عجب کیفیت و تاثیر ہوتی ہے اور ان کے زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک ایک فقرہ کبھی کبھی زندگیوں میں ایسا انقلاب لے آتا ہے اور ایسی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے جو برسوں کے مطالعہ و کوشش اور ہزاروں وعظ و پند سے بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی پُرتاثیر صاحب فیض خاصانِ خدا میں سے ایک معروف شخصیت حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کی تھی۔ ان کے اخلاصِ نیت، سادگی، بے نفسی اور تعلق مع اللہ کے متعدد واقعات ایسے ہیں جن کو پڑھ کر روح وجد کرتی ہے اور ایمان میں تازگی و طراوت محسوس ہوتی ہے، ایسے ہی مؤثر و دل پذیر واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو آئندہ سطور میں درج کیا جارہا ہے اور پہلی بار شائع ہورہا ہے۔

راقم سطور نے یہ واقعہ (گڈھی پختہ ضلع مظفر نگر کے) بلوچ خاندان کے ایک معزز و عمر رسیدہ شخص جناب حسن علی خاں صاحب بلوچ سے سنا تھا اور اسی وقت قلم بند کرلیا تھا، حسن علی خاں صاحب نے یہ واقعہ اپنی والدہ محترمہ سے سنا تھا جو حضرت مولانا مظفر حسین سے بیعت تھیں اور مولانا کی برگزیدہ و رابعۂ وقت صاحبزادی حضرت اُمّی بی (امت الرحمان) کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔

حضرت مولانا جس زمانہ میں تھے اس وقت سفر کی سہولتیں بہت کم تھیں، سفر عموماً پیادہ پا، یا چھکڑوں، بہلیوں میں ہوا کرتے تھے اور راستے غیر محفوظ اور پر خطر تھے۔ بہرحال

مولانا کسی ضرورت سے اپنے سب اہلِ خاندان کے ساتھ کاندھلہ سے گنگوہ کے لئے روانہ ہوئے اور اس وقت کاندھلہ سے گنگوہ جانے کے لئے وہ راستہ زیادہ موزوں سمجھا جاتا تھا جو موضع گڈھی پختہ سے ہو کر جاتا تھا، مولانا کا قافلہ گڈھی پختہ سے نکل کر گنگوہ کے راستہ میں تھا کہ اچانک اس قافلہ کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا، مولانا نے جب دیکھا کہ ہم ڈاکوؤں کے نرغہ میں آگئے ہیں اور ڈاکو حملہ کرنے، مارنے لوٹنے کے لئے آرہے ہیں تو حضرت مولانا گاڑھی سے اتر کر، ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور اس سے فرمایا کہ اپنا کام کرنے سے پہلے میری ایک بات سن لو، سردار نے کہا: "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" مولانا نے فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ ایک معاملہ کرلوں۔" ڈاکوؤں کے سردار نے اس کی تفصیل پوچھی تو مولانا نے کہا: "معاملہ اس طرح کرلو کہ، تم ہماری عورتوں کو مت چھیڑنا، ہاتھ بھی نہ لگانا اور ہم اپنے پاس کوئی زیور، روپیہ پیسہ اور قیمتی سامان نہیں رکھیں گے، سب تمہیں دیدیں گے۔ (ڈاکوؤں کے لئے ہدایت و اصلاح کا وقت آچکا تھا) انھوں نے مولانا کی یہ فرمائش قبول کرلی، اب ڈاکوؤں کا گروہ ایک طرف بیٹھ گیا، مولانا اپنی گاڑیوں (بہلیوں یا چھکڑے) کے پاس آئے اور سب عورتوں کو مخاطب کرکے فرمایا، کہ جس کے پاس جو زیور اور قیمتی سامان ہو، وہ دیدو۔ عورتوں، بچیوں نے اپنے اپنے زیورات اتارنے اور پیسے وغیرہ نکالنے شروع کردیئے، مولانا کھڑے ہوئے اس کی نگرانی فرماتے رہے، جب سب زیورات وغیرہ جمع ہوگئے تو مولانا ان سب کو ایک کپڑے میں باندھ کر ڈاکوؤں کے گروہ کے پاس لائے اور کہا: "بھائی! دیکھو، میں سب سامان لے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر گٹھری ان کے حوالہ کردی اور ڈاکوؤں کی اس بات کے لئے تحسین فرمائی کہ انھوں نے اپنی بات کو نبھایا اور کسی عورت کو دیکھا تک نہیں۔ ڈاکو وہ سامان لے کر خوش ہوگئے اور مولانا کا قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

مولانا کا قافلہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ مولانا کے ساتھ جانے والی عورتوں میں کچھ کھسر پھسر شروع ہوئی، حضرت مولانا نے اس کو محسوس کرلیا اور پوچھا کیا بات ہے،

عورتوں نے کہا، کچھ نہیں، مگر جب مولانا نے سختی سے معلوم کیا تو بتایا کہ وہ فلاں یہ کہہ رہی ہے کہ میری ہنسلی (گلے میں پہننے کا ایک زیور جو خاصا بھاری اور قیمتی ہوتا ہے) بچ گئی۔ میں نے کپڑوں کے نیچے چھپالی تھا، مولانا نے یہ سنا تو فوراً سواری روکنے کی ہدایت کی۔ گاڑی سے اتر کر مولانا ان خاتون کے پاس آئے اور فرمایا: "بی بی! یہ تو وعدہ خلافی ہے، چونکہ ہم ڈاکوؤں سے وعدہ اور معاہدہ کر چکے ہیں اس لئے یہ زیور ان کا ہو چکا ہے، لاؤ، مجھے دو، میں ڈاکوؤں کو دے کر آؤں گا۔" اس خاتون نے وہ زیور اتار کر مولانا کے حوالہ کر دیا، مولانا گاڑی سے اتر کر واپس گئے اور وہاں پہنچے جہاں ڈاکوؤں کا گروہ پڑا ہوا تھا، ڈاکو مولانا کو واپس آتا ہوا دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید بڑے میاں (مولانا) کے معاون و مددگار آگئے ہیں اور یہ مقابلہ کے لئے آئے ہیں، اس خیال سے ڈاکو ہتھیار اٹھانے لگے تو مولانا نے فرمایا، میں لڑنے کے لئے نہیں آیا، میں تو ایک بات کہنے اور تمھاری ایک امانت تمھیں لوٹانے کے لئے آیا ہوں۔

مولانا یہ فرمانے کے بعد ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا، "بھائی! میں تمھارے سے معافی مانگنے اور تمھاری ایک امانت واپس کرنے آیا ہوں۔ تم اپنے وعدہ اور بات کے سچے نکلے ہم نہ نکلے، یہ ایک زیور ہے جو ایک بچی نے اپنے کپڑوں میں چھپالیا تھا، مگر کیونکہ تمھارے سے وعدہ ہو چکا تھا اس لئے اب یہ ہمارا نہیں رہا، تمھارا ہے، میں یہی دینے کے لئے آیا تھا، یہ زیور سنبھالو اور اس بچی کی غلطی کو معاف کردو۔"

ڈکوؤں کا سردار مولانا کی بات سن کر بولا، "تم مولوی مظفر حسین کاندھلوی تو نہیں ہو، اس علاقہ میں تو وہی ایک ایسے سچے آدمی ہیں۔" مولانا نے فرمایا، "ہاں بھائی، مظفر حسین میرا ہی نام ہے۔" ڈاکوؤں کا سردار یہ سنتے ہیں مولانا کے قدموں میں گر گیا اور ڈاکوؤں کے پورے گروہ میں گریہ و بکا اور آہ و زاری شروع ہو گئی اور اسی وقت سب ڈاکوؤں نے اپنے اس کام اور تمام گناہوں سے توبہ کی، مولانا سے بیعت ہو گئے اور مولانا

کے قافلہ سے لیا ہوا ایک ایک سامان واپس کر دیا اور عہد کیا کہ ہم نے آج تک جن لوگوں کا سامان لوٹا ہے یا کسی قسم کی تکلیف پہنچائی ہے، ان کو تلاش کر کے ان کا سب سامان واپس کریں گے یا ان سے معافی مانگیں گے --- کسی نے سچ کہا ہے:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

عکس تحریر مولانا نصر اللہ خاں خویشگی

مکتوب بنام مرزا امیر بیگ کاندھلوی خلف مرزا شہباز بیگ

(شہباز بیگ سعادت یار خاں رنگین کا بڑا بھائی اور طہماس خاں کا بیٹا تھا)



غزل

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، رحمۃ اللہ علیہ

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو برصغیر ہندو پاکستان کی دینی علمی تاریخ و شخصیات اور علوم اسلامیہ میں جو مقام حاصل ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت نانوتوی کو منجملہ اور اوصاف و کمالات کے شعر گوئی کا بھی خاص ذوق تھا۔ ہر چند کہ شاعری ممتاز اہل علم کے لیے کبھی وجہ امتیاز نہیں رہی، لیکن حضرت مولانا تفنن طبع کے لیے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ مگر مولانا کے کلام کا کوئی مکمل مجموعہ آج تک نہیں چھپا، چند چیزیں ضرور شائع ہوئی ہیں اور وہ سب بھی یکجا نہیں ہیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔

ہمارے ذخیرہ میں حضرت قاسم نانوتوی کا ایک مختصر سا مجموعہ کلام محفوظ ہے جسمیں اردو، عربی، فارسی میں مختلف اصناف سخن کے نمونے موجود ہیں۔ اس مجموعہ کا آغاز ایک نفیس و لطیف غزل سے ہوتا ہے، یہ غزل قارئین احوال و آثار کے لیے پیش کی جارہی ہے۔

نور

جما کر تیری صورت روبرو ہم
کیا کرتے ہیں پہروں گفتگو ہم
کیا کرتے ہیں کہنا نامہ بر یاد
رخ گلفام زلف مشکبو ہم

اگر یوں ہی کٹے یہ زندگانی
توے جائیں گے کیا کیا آرزو ہم
نگاہ لطف کے ہیں زخم دل میں
کریں اے چارہ گر کیوں کر رفو ہم
پڑا رہنے دے اے شوق دل آرام
ابھی بیٹھے ہیں پھر کر چار سو ہم
بس اتنا تنگ مت کر وحشت دل
لیے بیٹھے ہیں اپنی آبرو ہم
دل مشتاق کی اپنی کہانی
کہیں گے گر ملیں گے پھر کبھو ہم
لب شیریں سے خود کامی تو معلوم
پئیں گے ہمدم اب اپنا لہو ہم
نہ جاناں ہے، نہ جاں ہے اور نہ دل ہے
کریں کس کس کی یا رب جستجو ہم
نہیں ساقی تو ہمدم توڑ دیں گے
کسی پتھر پہ ساغر اور سبو ہم
کبھی کیا کیا تھا اور اب کیا ہے ارماں
کبھی بیٹھے بھی تھے مل کر کے تو، ہم
رقیبوں کا خطر ہے گا وگرنہ
سنا دیتے فسانہ مو بہ مو ہم
پئے تشہیر مشت خاک قاسم
اڑائیں گے کہیں ہیں، کو بہ کو ہم

مکتوبات
مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ

حضرت حکیم صاحب کی مجلسیں اور ان کے مکتوبات معلومات، ادب و انشاء اور روانی قلم کا ایک نمونہ ہوتے تھے اور ان میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جس میں دینی علمی فوائد مضمر ہیں۔ یہاں حکیم صاحب کے تین گرامی نامے اور چند مختصر افادات پیش کئے جا رہے ہیں۔ خطوط میں سے پہلے دونوں خط کیرانہ کے ایک طبیب اور اپنے دینی اصلاحی جذبات کے لحاظ سے عجیب و غریب شخصیت حکیم انوار احمد مرحوم کے نام ہیں، حکیم انوار احمد صاحب ایک خاص مزاج رکھتے تھے اور برصغیر کی تمام دینی تحریکات، کاموں اور افراد کو اسی سے جانچتے پرکھتے تھے اور ان کو اس معیار کا نہ پا کر جو ان کے ذہن میں تھا، افسردہ و غمگین ہوتے اور حالات کی درستگی کے لیے مختلف تدبیریں سوچتے، اہل علم اور بزرگوں سے خط و کتابت کرتے۔ اسی سلسلہ کی ایک یادگار مراسلت وہ خطوط ہیں جو مولانا حکیم عبدالرشید محمود، تھو میاں صاحب نے حکیم انوار احمد صاحب خطوط کے جواب میں لکھے حکیم تھو میاں صاحب کے جوابات ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں اس میں سے دو خط یہاں درج ہیں ان خطوط سے حکیم انوار احمد اور مولانا حکیم تھو میاں صاحب کے فکر و نظریات کی بعض گرہیں کھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ آخری تیسرا خط دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ (منعقدہ جمادی الاولی ۱۴۰۰ھ / مارچ ۱۹۸۰ء) کے متعلق ہے۔ اس اجلاس سے حکیم صاحب منشرح اور مطمئن نہیں تھے، متعدد بزرگوں کی طرح حکیم تھو میاں صاحب کی بھی صاف رائے یہ تھی کہ یہ اسلاف کے طریقہ کے خلاف اور بے محل ہے اور اس سے کوئی خاص فائدہ متوقع نہیں۔ حکیم صاحب کا یہ گرامی نامہ پڑھئے اور سوچئے کہ انھوں نے جو اندیشے ظاہر کئے تھے وہ کس طرح سامنے

آئے اور "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کی تفسیر کیونکہ ظاہر ہوئی - یہ خط کیرانہ کے ایک اور مخلص دباخدا شخص منشی مقصود احمد عثمانی کے نام ہے - اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں مگر ڈاک خانہ کی ۱۵ اگست سنہ ۱۹۷۹ء کی مہر ثبت ہے - دونوں صاحبان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے :

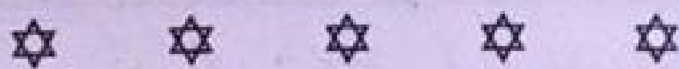
(۱) حکیم انوار احمد خلف حکیم خلیل احمد بن حکیم فضل الرحمن صدیقی یہ خاندان تقریباً دو سو سال پہلے تیسٹروں سے کیرانہ منتقل ہوا - سنہ ۱۹۱۴ء / ۱۳۳۲ھ میں پیدائش ہوئی - تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہوئے اور اسی سے ریٹائر ہوئے - اصلاح اور خدمت دین کی بے حد تڑپ تھی اس مقصد کے لیے علاوہ خط و کتابت کے دو تین رسائل بھی لکھے - ہمیشہ اسی دھن میں لگے رہے اسی حال میں ۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ء (۲۸ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ) کو کیرانہ میں وفات پائی -

(۲) منشی مقصود احمد خلف محمود احمد ان سعادت اللہ بن نجیب اللہ کیرانہ کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق تھا - سنہ ۱۹۰۲ء (۲۰ - ۱۳۱۹ھ) میں ولادت ہوئی محکمہ تعلیم سے وابستہ اور مختلف تعلیم گاہوں میں مدرس رہے -

شائخ و صوفیاء سے خاص تعلق رہا - شروع میں سماع وغیرہ کا ذوق تھا مگر ایک مجلس سماع کا بے انتہا اثر ہوا - مہینوں اس سے متاثر رہے خواجہ عزیز الحسن صاحب کی توجہ سے یہ اثرات ختم ہوئے اس کے بعد سے خواجہ صاحب سے ارتباط و ارادت ہو گئی تھی -

آخر میں ایسی سادہ اور زاہدانہ زندگی گذارتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس قدر کم سامان کے ساتھ کس طرح زندگی گذارتے ہیں ۶ فروری ۱۹۸۲ء (۱۱ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ) کو کیرانہ میں وفات ہوئی دربار کلاں کے قبرستان میں دفن کیے گئے -

حکیم انوار احمد صاحب کے نام مکتوبات ہمیں جناب توفیق احمد صاحب علوی (خلیل منزل، کیرانہ) سے حاصل ہوئے ان کا شکریہ واجب ہے -



از گنگوہ عبدالرشید محمود عفی عنہ

مکرمی حکیم صاحب زید لطفہ سلام و تحیات

والا نامہ سے مشرف ہوا سائل بھی معقول! سوال بھی معقول اور قدرتی کہ علاج کیا ہے؟ غالباً آپ کی مراد تفصیلی واضح اور متعین تدبیر و علاج سے ھے ورنہ اجمالاً تو میں نے عرض کیا ہی تھا کہ:

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

یعنی انبیائی دعوت! ربط باللہ ۔ اور ایمان کا زندہ اور بیدار احساس ۔ بے شک عملی طور پر اقدام تفصیل و توضیح طلب بھی ہے اور تعین و تنقیح کا خواہاں بھی ۔ تشخیص کے بعد تجویز کا سوال قدرتی امر ھے جو اجمالاً تو عرض کیا گیا مگر تفصیل کی طرف توجہ نہیں کی گئی ۔ اس لیے کہ یہ توجہ نہ تو فرد و احد کا کام ہے نہ خطاب عام اس کا محل ہے ۔ یہ اجتماعی اور مشاورتی بحث و نظر کا محتاج ہے اس کے لیے شورائی اجتماع و اجتہاد اور اہل بصیرت کا تفکر آزما بورڈ درکار ہے اس لیے کہ عمل کی راہیں بھی مختلف سامنے آئیں گی، سوالات بھی گوناں گوں پیدا ہوں گے، آراء بھی حسب فکر متعدد ہوں گی ۔ شعور ایمانی درد و جذب پیدا کرے گا ارباب فکر و نظر عمل کی راہیں متعین کریں گے ایک باعثہ ہو گا دوسرا فاعلہ (حسب اصطلاح طبی)۔

آپ طبیب بھی ہیں طبی مثال ملاحظہ ہو ایک مریض کے متعلق یہ مشخص ہو گیا کہ یہ قلب کا ضعیف ہے آلات ہضم کا مریض ہے اعصابی عدم توازن کا شکار ہے اس کے لیے اجمالاً ضروری ہے کہ مقویات اعصاب مفرحات قلب اور مصلحات ہضوم ادویہ دی جائیں ۔ اساءت آلات ہضم اصالتہً مرض ہے تو زور دیا جائے اصلاح ہضم پر اور رعایت مرکوز رہے تفریح قلب اور تقویت دماغ اعصاب کی ۔ اس کے برعکس اگر اصالتہً قلب و دماغ ماؤف ہے تو زور دیا جائے مفرحات و مقویات پر اور رعایت ملحوظ رکھی جائے آلات ہضم کی ۔ گویا عرضی و مرضی کا فرق، بالاصل و مرض

کی تفریق اصولی طور پر اس تعین تجویز کے بعد سوال پیدا ہو گا تعین ادویہ کا اس میں حذاق و اطباء مختلف ہو سکتے ہیں ' اہم مریض کے لیے اب طبی بورڈ ہو گا اور شورائی استبشار مفید۔

اب دوسری بات کا جواب معروض ہے مگر پہلے میرا فکر و موقف ملاحظہ ہو:
الدیانة والسیاسة توامان ' دین وسیاست دونوں جڑواں بھائی ہیں ' یہ حدیث ہے دونوں کی رعایت ضروری ہے۔ علامہ اقبال کا کلام ہے:

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہی چنگیزی

اور عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

وہ تیاہ زور بازو یہ خراب رسم تقویٰ۔ کہ عرب نرا نمازی تو عجم نرا سپاہی
میں تینوں کا قائل ہوں مدرسہ کا بھی خانقاہ کا بھی 'رباط کا بھی:

ع جے تو مدرسہ و خانقاہ اٹھے تو سپاہ

میں مدرسہ پر بھی اکتفا نہیں کرتا' محض خانقاہ پر بھی قانع نہیں' محض سیاسی رباط پر بھی نہیں' جامعیت کبری نبوی تعلیم
"یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ"
اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الخ
هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی الخ : تینوں کو کمال دین تصور کرتا ہوں مگر حسب حالات' حسب مصالح وقتیہ' حسب تیسیر وقت' میں اس حدیث پر بھی ایمان رکھتا ہوں جس میں دیانت کے پانچ اصول ارشاد فرمائے گئے:

بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لااله الا الله الخ

اور اس ارشاد نبوی پر بھی یقین رکھتا ہو جس میں سیاست کے پانچ مناہج فرمائے گئے:

انی آمرکم بخمس الله امرنی بهن الجماعته والسمع الخ

البتہ دیانت کو مقصود اور سیاست کو وسیلہ کا درجہ دیتا ہوں' وسائل و مقاصد میں خلط کو جہالت سے ناشی تصور کرتا ہوں۔ میں شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کے کلام خلافت ظاہری خلافت باطنی پر بھی انشراح رکھتا ہوں۔

اس سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ میں نہ کوری مولویت سے مطمئن نہ خانقاہت محضہ اور سیاست عرفیہ خالصہ سے، میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اسلام انٹر نیشنل انقلاب کا داعی ہے، خالص انقلاب نہیں اصلاح سے مقید جیسا کہ ھوالذی ارسل رسولہ باالھدی الخ سے ظاہر ہے - ولوکرہ المشرکون سے شوکت کا حصول بھی ضروری سمجھتا ہوں، جس کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے، ایک نصیب العین (آئیڈیا) - دوسرے طریق عمل (پروگرام) تیسرا مرکزی جماعت منتظمہ (نافذ کرنے والی سنٹرل کمیٹی) گویا حزب اللہ - ہر جماعت پارٹی یا پالٹیکس کے لیے یہ تینوں ضروری ہیں، مگر حسب تیسیر وقت و استطاعت ہے، ورنہ مکی زندگی آفاق، صلی اللہ علیہ وسلم کی سامنے ہے ہی جو جبر سے مقہور ہے۔

بے شک میرے جد امجد، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، سید احمد شہید، ولایت علی، یحیٰ علی، احمد اللہ عظیم آبادی، حضرت شیخ الھند حضرت مدنی سب سیاسی بھی تھے اس سے کس کو انکار ہے، مگر آپ نے ناحق اتنے تنزل سے کام لیا اور ماضی قریب کے اخلاف صالحین کا ذکر فرمایا آپ تو اسلاف صالحین متقدمین بلکہ حضرات انبیاء علیہم السلام خاصۃ سید الانبیاء والمرسلین امام الاولیاء المتقین سید ولد آدم عروس مملکت الھیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی کردار کا ذکر فرماتے جن کی زندگی میں تمام مسلمین کے لیے اسوۂ حسنہ اور جن کے ارشاد گرامی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سیاست کا ذکر ہے چنانچہ فرمایا: کانت بنوا اسرائیل تسوسھم الانبیاء. فاذا ھلک نبی خلفہ نبی یعنی انبیاء بنی اسرائیل برابر اسرائیل کی سیاست اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے پھر عیسویت کے ازمنہ قدیمہ میں بھی مذہبی قسیسین اساقفہ وقت اس پر عامل رہے اور اسٹیٹ ہمیشہ کلیسا کے ماتحت رہی پھر بتدریج اسٹیٹ نے کلیسا کی بالا دستی سے اپنے آپ کو آزاد کوالیا نتیجۃ عدلیہ کا معیار ختم ہو گیا۔

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی سیاسی رہے دیانت وسیاست کا مظہر اتم، جبکہ حضرت عمر تواجھز جیشی وانا فی الصلوۃ فرماتے ہیں کہ میں حالت صلوۃ میں بھی عساکر کی صف بندی و تجہیز کرتا ہوں، اپنے اکابر قریبہ انہی اکابر

سلف کے متبع و مقلد تھے۔ مگر یہ بات کیونکر نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ وہ السیاسۃ الدینیہ کے حامل تھے نہ السیاست العصریہ عرفیہ کے وشتان مابینہما قریب کے حضرات بضرورت ادھر آئے تو باحتیاط بلیغ قدم قدم پر دامن بچاتے ہوئے۔ سمیٹتے ہوئے۔ تفصیل کی آپ سے اہل علم کے لیے ضرورت نہیں۔

آج کی سیاست، سیاست عصریہ عرفیہ کا منہاج کیا ہے؟ حکمت عملی پر اصولوں کی قربانی، مقاصد مزعومہ مظنونہ کے لیے مواقف کی تبدیلی، حسب مصالح ادل بدل، دیانت کی مقصودیت کو حکومت کی موعودیت پر نثار کر دینا، کبھی امیدواری کو ناجائز کہنا، پھر امیدوار بن کر کھڑے ہوجانا، کبھی پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہنا، پھر محاذ کے ساتھ اشتراک کر کے خود ٹکٹ تقسیم کرنا، کبھی تصور خلافت پر اصرار، پھر پارلیمانی جمہوریت کو عین اسلامی کہہ دینا۔ کبھی عورتوں کے حق ووٹ دہندگی پر انکار پھر عورتوں کی صدارت پر اظہار اطمینان، کبھی غیر اللہ اور غیر اسلامی نظام سے بیزاری، پھر غیر اسلامی پارلیمنٹ کی وفاداری کا بونڈ بھرنا۔

ع　　چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

تو با زمانہ بساز

سیاست عصریہ عرفیہ کے یہ امارات ہیں۔ کیا سیاست عصریہ سیاست فنیہ ہے کیا نسبت اکابر کا مجبوراً سیاست عصریہ میں باحتیاط ادنی شمول اور آج کی سیاست میں کلی دخول پہلی "اندرون قعر دریا تختہ بندم" کی بات۔ دوسری سویداء قلب سے اپنا لینے کی مگر وہ شیر و شکر والی پالیسی شیر و شیر کا فرق، بعض افراط سے گئے بھی تو بعد میں بیزار بھی ہوئے، حضرت تھانوی لیگ کی طرف مائل ہوئے پھر تبری کی، حضرت مدنی کانگریس میں منہمک ہوئے پھر آخری ایام و سال میں جس مایوسی و بے زاری کا اظہار فرماتے تھے وہ مجھے معلوم ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس پر وقوف نہ ہو۔ تاہم آپ نے خیال نہیں فرمایا، سوال میں جلدی کی، حضرت مدنی کے خلیفہ کی ڈھائی گھنٹہ کی گفتگو سیاست کے ذکر سے میرا مقصد انکار ضرورت سیاست نہیں تھا سیاسی اشتغال بلیغ اور افراط و غلوفی الوسائل منشا تھا، وسائل کا بھی ایک درجہ ہے مگر اس میں ایسا غلو کہ مقاصد سے انفکاک کی شان نمایاں ہو اور وسائل کے

مقصودیت کا اشتباہ پیدا ہوجائے غیر معتدل ہی نہیں غلط بھی ہے۔ اور فکری خبط کو مقاصد کے مقام پر لا اتارنا دین و دانش، علم و حکمت، فکر و بصیرت اور ادرک و ذوق سلیم کے قطعاً منافی ہے اللہم ارنا الاشیاء کماھی۔

علم و عمل میں صحت اور حق و راستی کی معرفت حکمت ربانیہ ہے جس کو وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اتنا طویل وقت نہ خدا کا ذکر نہ رسول کا، قرآن کا نہ سنت کا، آثار کا نہ اقوال کا، عقائد کا نہ حقائق کا، نظائر کا نہ بصائر کا، نہ اذکار و تذکار اولوالالباب نہ ائمہ ھدی۔ بڑے ذوق و دلچسپی سے پوری تائید و تحمید و ثنا، و منقبت کے انداز میں قلبی تائید و تصدیق کے ساتھ ائمہ ضلال اخوان الشیاطین اعداء اللہ و رسولہ کے بار بار اسماء، ان کی تقریریں ان کے نظریات کو مزے لے لے کر بیان کرنا ان کے نظریات اجتماعی فیصلوں ریزولیشنوں کو سراہنا، یہ کس رجحان کی غمازی تھی۔ اکابر سلف نے تو مسلم مناطقہ و فلاسفہ کے نظریات کو بھی اشراقیین کی گندگی سے تعبیر کیا، حضرت گنگوہی نے ان کو باعث غباوت دینی فرمایا، حضرت شیخ الھند نے رواقیین کی نجاست فرمایا۔ فخر الدین رازی (؟) کے شعر کو اخیر میں حب حقیقت کا رائحہ نصیب ہوا تو شیخ الرئیس نے بار بار دہرایا:

نہایة اقدام العقول عقال
وغایة سعی العالمین ضلال
ولم نستفض من بحثنا طول عمرنا
سوی ان جمعنا فیه قیل وقال

علامہ اقبال نے فرمایا:

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیمانہ
یا عقل کی روباہی یا عشق ید اللہی
یا حیلہء افرنگی یا حملہ ترکانہ

حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق کے نسخہ تورات پڑھنے پر کس

قدر انقباض و تبغض کا اظہار فرمایا کہ حضرت صدیق کو متنبہ کرنا پڑا "ثکلتک امک یا ابن خطاب" حالانکہ یہ مسلم فلاسفہ تھے و چہ جائیکہ؟ ۔

غالباً میں پوری بات کہہ سکا ہوں امید ہے کہ اب کوئی خلجان نہ رہا ہو گا رہے تو انشاء اللہ عند الملاقات، کہ تحریر کافی نہیں طول تحریر باعث تعب بھی ہے نا تمام بھی، میرے لیے خصوصاً۔

آسودہ شبے باید و خوش مہتا بے
تا با تو حکایت کنم از ہر با بے

کاش آپ میرے بیان کے اختتام پر وہیں یہ سوال کرتے، حاشا کہ میں کوئی ناگواری محسوس کرتا اہل علم کے معقول سوال سے طبعیت شگفتہ ہوتی اور کھلتی ہے میں تفصیلا جواب عرض کرسکتا اور آپ کا مشکور ہوتا کہ آپ نے مجھے ان ابواب پر دعوت کلام دی۔

آپ نے کارڈ کے شروع میں (خلیفہ الارض تابع و متبوعیت) بھی لکھا ہے، جانے کیا منشاء ہوگا اس کے علاوہ اس تقریر کو تاریخی مقفی وعظ فرمایا ہے، اس کی وضاحت ضروری تھی کیا مقصد تھا؟

حق تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنے اور اپنوں سے مانوس فرمائے اپنی اور اپنوں کی صراط سوی دکھائے۔ ہمارے قافلہء افکار رو جذبات آراء و تاثرات کو اسی پر گامزن کرے، ہم جو دیکھیں انہی کی آنکھ سے دیکھیں جو پرکھیں انہی کے معیار سے پیمانے سے میزان سے میٹر سے پرکھیں۔ گفتار، کردار رفتار افکار، اعمال، اقوال، میں انہی کے مقتفی آثار ہوں انہی کی پسندیدگی محبت اور تقلید میں جئیں، مریں محشور ہوں والسلام۔

رسید سے ضرور مطلع فرمائیں مزید کچھ سوالات ہوں تو ملاقات پر موقوف رکھیں خدا کرے کبھی میسر ہو۔

رشید منزل گنگوہ ۲۸ صفر ۱۳۹۲ مطابق اپریل ۱۹۷۲ء

ایک بات عرض کرنا ضروری ہے آپ نے فرمایا کہ آپ نے کوئی شافی کافی نسخہ تجویز نہیں فرمایا، میں نے انبیائی دعوت کا جو نسخہ پیش کیا تھا اگرچہ اجمالی

تھا مگر بہر کیف تھا، کیا انبیائی دعوت سے بڑھ کر کوئی نسخہ کوئی تدبیر علاج کافی شافی ہوسکتا ہے، شفاء و کفایت کی اقدار کا احاطہ ضروری ہے یا پھر معانی کی تحدید، یا مقصد کی تعیین۔ کس مرض کی کیسی شفا کس قدر کی کیسی کتنی کفایت؟ انبیائی دعوت قرآن ہے اور اس کی توضیحات تفسیرات حدیث، اس سے بڑھ کر کون چیز شافی کافی ہو سکتی ہے اپنا تو یہی یقین ہے یا پھر میں سمجھا نہیں سمجھ پر اصرار نہیں۔



از حکیم عبدالرشید محمود عفی عنہ

مکرمی حکیم صاحب ---------- سلام مسنون

کارڈ ملا، حسب تحریر مکتوب گرامی واپس کر رہا ہوں، اس کارڈ میں آپ کا یہ جملہ بڑا دلچسپ اور حقیقت پر مبنی ہے کہ آپ بالکل میرے ہم خیال ہیں، بے شک میں نہ صرف آپ کا ہم خیال ہوں بلکہ ہم مسلک بھی ہوں، ہم مذہب بھی ہوں، ہم وطن بھی ہوں، ہم موطن بھی ہوں، میرا اور آپ کا اتحاد و اشتراک جنسی اور نوعی بھی ہے کہ ہم حیوان ناطق بھی ہیں مذہبی بھی ہے کہ ہم مسلمان اور امت وسطہ ہیں، ملک وطن اور صوبہ کا بھی کہ ہندی نژاد اور یوپی کے باشندہ ہیں، قبائلی و معاشرتی بھی ہے کہ صدیقی فاروقی عثمانی علوی انصاری نعمانی ایک دوسرے کے اکفاء ہیں اور طرز بود و ماند میں متحد ہیں۔ مگر ایک فرق ایسا ہے جس کی وجہ سے میرے اور آپ کے درمیان فاصلہ ہو گیا ہے کہ آپ تو قلمی جہاد میں مصروف ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے اس خط میں دعوی کیا ہے اور میں بے چارہ پسماندہ عیش وتن پروری اور کسل وماندگی کا شکار جیسا کہ میرا اپنا حال اور اس کا اعتراف ہے:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضاں میں

کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

میں قاعدین غیر اولی الضرر میں ہوں اور آپ مجاہدین فی سبیل اللہ کی صف میں، میں صرف ملا، اور آپ مجاہد:

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذان میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

آپ پہاڑوں میں رعشۂ سیماب پیدا کرنے والی سعی میں مشغول، میں ملائیت جامدہ میں محدود، ایک ہیولی برق خرمن کا، دوسرا مشت خاک، ایک میں آزادی دریا کی وسعت دوسرے میں داری ساحل کی خود فریبی، ایک طرف علوئے ہمت بالغ نظری، دوسری طرف قصور ہمت اور دون ہمتی، اس طرح میری آپ کی راہ بالکل الگ ہو جاتی ہے اور درمیانی فاصلہ دراز ہو جاتا ہے۔

میں اس شب تیرہ و تار میں ایک ٹمٹماتی شمع پر ہی قانع، آپ ریگستانوں میں سیل عرم لانے والے حوصلہ مند مدعی جہاد، آپ جوئے شیر لانا چاہتے ہیں، میں کاس دہاق کے چند قطروں پر راضی، آپ انجم و افلاک مہ و پروین پر نظر پیما، اور میں قطعہ خاک پر آسودگی طلب، آپ کی نظر میں خالد جرار، حیدر کرار، میری نظر میں صرف حافظ شیراز، کہاں شیر نیستان، کہاں شیر قالین۔ آپ خیر القرون کے دور کی جامعیت کی باتیں کرتے ہیں، میں اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ کے بھی مابعد کے دور کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ اور عشر ماموربہ کے اتباع کو ہی باعث نجات خیال کرتا ہوں، آپ دین کے تمام گوشوں اور شریعت و طریقت کے تمام ابواب، فکر و نظر کی مکمل تعمیر، قول و عمل کے مکمل (بلوغ جس کو آپ جانتے ہیں نہ میں) آپ ادنی تنزل رکھنے والے معاشرہ و جماعت کے ساتھ بھی چلنے اور اس کو اپنانے کے لیے تیار نہیں، میں کم درجہ کی ناتمام چیز کو بھی غنیمت سمجھ کر اس کی اعانت و رفاقت کو موجب اجر و رضا تصور کرتا ہوں۔ آپ کھائیں گھی سے یا جائیں جی سے، پر مصر میں اس پر ہی مکتفی۔

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہونچے وہاں
گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

اس کے بعد بھی اگر آپ میرے اور میں آپ کا ہم خیال ہوں تو یہ ایک دلچسپ خوش فہمی ہو گی ورنہ عملاً تو بندہ یہی کہے گا کہ ہم سب سر گشتۂ خمار رسوم قیود ہیں ہم خیال تو نہیں ہم عمل ضرور ہیں ۔ ویسے وزن بندہ پرور نہ میری تقریر و خطابت کا نہ تیری تحریر و صحافت کا:

چشم جب تک ہو نہ جائے خواب گاہ جبرئیل
پائمال ورائیگاں ہے رسم وراہ زندگی

آخر میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت تھانوی قدس سرہ جن کو آپ مرشدی مولائی تحریر فرما رہے ہیں، آپ کے تو وہ مرشد ہوں یا نہ ہوں میرے تو ہیں، میں نے ان سے بیعت کی ہے اور اپنے ناقص وجدان و برہان سے حضرت کو دیکھا اور میں بحمد اللہ سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت کی زندگی کے تابناک گوشے کون کون سے ہیں ۔ ان پر عقلی و نقلی دلائل سے گفتگو کر سکتا ہوں ۔ شاید میرا یہ کہنا غلط نہ ہو کہ میں حضرت کی معرفت آپ سے زیادہ رکھتا ہوں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت، صحابہ کرام کی سی جامعیت علم و عمل رکھتے تھے؟ اجتماعی ارتفاعی گوشے حضرت کی زندگی میں کیا ہیں، کوئی ان کی نشان دہی کر سکتا ہے ۔ ہرگز نہیں کر سکتا، البتہ محمل حسن پر محمول کر سکتا ہے، تاویل حسن کر سکتا ہے، اعذار پیش کر سکتا ہے اور وہی آج میں بھی آپ جیسے وسیع الفکر لوگوں کے سامنے عرض کر سکتا ہوں ۔

اور اس سے قبل کیا ہے بعد میں کیا ہے ۔ بات طویل ہوتی جاتی ہے باقی عندالملاقات اگر میسر ہوئی ۔ میرا کیرانہ کا سفر ارادی نہیں تھا جبری تھا کیرانہ والے آتے اور بار بار اصرار کرتے، آخر مجبور ہو گیا دونوں دفعہ ایسا ہی ہوا، ورنہ میں کہاں اور اہل علم کے اسفار طیبہ کہاں ۔ والسلام ۔

رفع استدراک کے طور پر ایک بات عرض کرتا چلوں ۔ تبلیغی کام میں جاہل عوام ہی نہیں اہل علم خواص بھی ہیں اور اگر کسی جگہ جاہل اس میں لگے ہوئے ہیں تو پڑھے لکھوں کو کس نے روکا، وہ آگے بڑھیں ۔ سبحان اللہ وہ خود تو کچھ کریں نہیں کرنے والوں پر اظہار ناخوشی کرتے ہیں، یہ تو معقول بات نہیں ۔ انبیاء

علیہم السلام کی طرف آنے والوں کو کفار بھی یہی کہتے تھی کہ اراذ لنا بادی الرای یعنی رذیل عوام ان کا اتباع کرتے ہیں۔ خواص شرفاء کریں نہیں رذیل عوام کو کرنے نہ دیں بڑا ظلم ہے، ذرا سورہ عبس پڑھ لیجئے عبس و تولیٰ ان جاء الاعمیٰ۔

یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ میں آپ کی اس تحریر سے جتنا کچھ سمجھ سکا اور جو دفعات آپ نے قائم کیں ان سب کا جواب سابقہ مراسلات میں موجود ہے اگر غور کریں میں، اس میں شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا مقالہ خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ کا اقتباس عرض کر چکا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

آپ جزوی خلافت جزوی تجدید جزوی اصلاح کے قائل نہیں ہیں، خوب خود صحابہ میں یہ فرق موجود ہے کوئی محدث ہے کوئی فقیہ، کوئی مفسر ہے کوئی مجاہد کوئی موئید بہ روح القدس حسان ہے، کوئی زاہد ابوذر، کوئی ارحم، کوئی اشد، کوئی احیٰ، کوئی اقضیٰ، کوئی اقرا القوم ہے کوئی امام العلماء، کوئی امین امت ہے، کوئی سیف اللہ۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت حسان نے کبھی جہاد و قتال میں حصہ لیا، یا خالد بن ولید نے کبھی درس حدیث دیا، حضرت بلال نے ابوھریرہ کا کام کیا یا، ابوھریرہ بلال کی جگہ آئے، یہ سب سے اصحاب نبی خلفاء نبوت ہیں۔

آپ کوئی تعمیر شروع کریں معمار کا کام الگ ہے نجار کا الگ۔ حداد کا دوسرا ہے، رنگ سفیدی کرنے والوں کا دوسرا پھر اسی مکان میں فٹینگ کرنے والا اور ہے، سب سے پہلے نقشہ بنانے والا اور یہ سب ایک ہی چیز کی تیاری میں مصروف ہیں مقصد تقسیم کار اور تکمیل کار ہے، اس بات کا سمجھنا کچھ بھی دشوار نہیں۔

حضرت تھانوی کی بات آپ نے لکھی، معاف کیجئے اس شخص کو اور اس کی بات کو سمجھنے کے لیے بھی وقت اور تعلیم درکار ہے، صحبت و رفاقت درکار ہے، ادراک اور فراست درکار ہے مناسبت اور انصباغ درکار ہے:

جہلاء کو امر بالمعروف جائز نہیں یچ ہے، لیکن تبلیغ میں تو امر بالمعروف نہیں، تعلیم معروف و منکر اور دعوت اصلاح و اخلاص ہے، تفصیل کا وقت نہیں۔

آپ کا یہ جملہ کہ عبادت کرنا کوئی کمال نہیں معاصی چھڑانا کمال ہے معاف کیجئے معاصی چھڑانا بھی تو عبادت ہے، آپ پہلے عبادت کا اپنا ذہنی تصور صحیح کرلیں، اور ذرا کمال اور شرائط کمال کو بھی نکر میں لائیں۔ آپ کمال کی بات کر رہے ہیں میں زوال سے ڈر رہا ہوں، کمال نہ حاصل کیجئے زوال سے بچ جائیے۔
کاش آپ سامنے ہوتے تو کچھ اور کہتا

بکی کی بات تعجب خیز ہے اور اپ کی ذاتی سیرت کے ترشحات ہیں، افسوس مجاہد اور اتنا نازک کہ ذراسی بات میں اس کی بکی یعنی اہانت ہو گئی یہ احساس کمتری ہے:

عشق میں ذلت بھی عزت ہو گئی لی فقیری بادشاہت ہو گئی
عشق صادق ہے تو پھر حسن کی تعزیر نہ دیکھ

اس نزاکت سے کیسے جہاد ہو گا اور کہنا کہ احوال کے اختلاف سے بعض دفعہ زوال سے بچنا بھی کمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے حال کے اعتبار سے فیصلہ ہوتا ہے، ایک شخص کے لیے بیٹھنا کمال ہے دوسرے کے لیے زوال، دوسرے کے لیے اٹھنا کمال ہے۔ بیٹھنا زوال۔

لیجئے میں دو حدیثیں پیش کرتا ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور میرے اس مضمون کی منصوص سرکاری دلیل ہے اور یہ دونوں انہیں آپ کے مرشد حضرت تھانوی کی کتاب التکشف فی مہمات التصوف میں موجود ہیں اس معرکۃ الاراء کتاب کا کبھی آپ نے مطالعہ کیا ہے؟ شاید نہیں کیا، اور نہ کر سکتے ہیں وہ آپ کے ادراک سے بلند ہے وہ طیور بلند پرواز کی زبان وفہم کے مطابق ہے اور "زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم" آپ اس سے بیگانہ ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں۔
نعم الرجل الفقیہ فی الدین ان احتیج الیہ نفع، وان استغنی عنہ اغنی نفسہ یعنی وہ فقیہ فی الدین دین کا علم وفہم رکھنے ولا۔ بہت اچھا آدمی ہے کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانا چاہے اور اس کے پاس آئے تو وہ نفع پہنچائے اور اگر نہ آئے تو بے نیازی سے اپنی جگہ بیٹھا رہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:
ان اللہ لایعذب العامۃ بعمل خاصۃ حتی یرو المنکر من ظہرا نہم وہم

قادرون علی ان ینکرو وھم لاینکرون فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ العامہ والخاصة ---- جس کا مطلب ہے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر نہ کرنے والوں پر عذاب آجانے کا خوف ہے، بے شمار آیات و احادیث اس مضمون پر وعید کے طور پر آئی ہیں۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً

اب ایک جگہ اپنے مقام پر بے نیازی سے بیٹھ رہنا پسند کیا جا رہا ہے دوسری جگہ اس طرح بے نیازی و مستغنی پر وعید اور تخویف و انذار کا معاملہ ہے۔

ذرا غور تو کیجئے اس میں کس کے لیے کمال ہے کس کے لیے زوال، یہ بات آپ کے ذہن میں اگر آگئی تو یہ الجھاؤ دور ہو جائے گا۔

جلال عشق و مستی بے نیازی
جمال عشق و مستی نے نوازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدر
زوال عشق و مستی حرف رازی

اس میں ذرا جائزہ تو لیجئے جلال و جمال اور کمال و زوال میں کہاں ہے شان نوال اور کہاں منحصر نوال، کس کے لیے کیا چیز موزوں ہے، نصوص قطعیہ ثابتہ آیات و سنن کی رو سے کیا حدود کس کے لیے، جلال و جمال کمال زوال نوال ممکن ہیں، کاش ملاقات ہوتی تو توضیحات تکمیحات توابعات لواحقات لازمہ سے بھر پور بات کہہ سکتا۔

آپ نے فرمایا صرف تعدادی کثرت اور صرف نماز کے ساتھ وہ بھی مکمل نہیں - آپ نماز کو حقیر سمجھ رہے ہیں، تعجب ہے وہ بھی مکمل نہیں، مکمل کی تعریف؟ اسکا معیار؟ اس کی علامات و امارات؟

روح الصلوة ھی الحضور مع اللہ ولا ستشراف للجبروت و تذکر جلال اللہ مع تعظیم ممزوجة و طمانیة __ ارشاد ولی اللہ۔

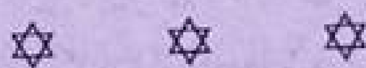
انماھی تسبیح و تھلیل و تکبیر __ ارشاد نبوی

آپ اسے سمجھ گئے؟ بات اپنی صلاحیت سے بڑھ کر نہیں کہنا چاہیئے۔ آپ کے مرشدی و مولائی حضرت تھانوی نے فرمایا تھا ایک موقع پر ، ہمیں تو نماز پڑھنا ہی نہ آیا امر عبودیت بجالاتے ہیں۔ آپ ہی فرمادیجئے آپ نماز پڑھتے ہیں۔ تکمیل کے متعلق کیا خیال ہے، دور سے بیٹھ کر بات کرنے کی جرات، کام کچھ بھی نہیں تنقید پر آمادہ۔ چند روز کسی ادنی کی صحبت بھی میسر ہوتی تو یہ بات نہ کہہ سکتے معاف کیجئے۔

انھوں نے دین کو کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اچھا اگر جماعت کی کوئی افادیت نہیں نماز مکمل نہیں، اخلاص موجود نہیں۔ جہلاء کار فرما ہیں۔ تو آپ آیئے، آگے بڑھیے، تلقین کیجئے تکمیل صلوۃ ارتکاز اخلاص کی سعی کیجئے جہلاء کے ہاتھ سے باگ ڈور لے کر عنان قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیجئے، اپنی امارت میں لے کر چلئے افادیت دکھلائیے جماعت کے اکابر تو بہت بے نفس ہیں آپ کے مشکور ہوں گے اور میرا شکریہ پہلے ہی قبول کیجئے، گو میں قاعدہ سے جماعت کا آدمی بھی نہیں تائید حمایت البتہ کرتا ہوں۔



از گنگوہ عبد الرشید محمود غفی عنہ

مکرمی ----- سلام مسنون

خط ملا آپ نے دارالافتاء سے دریافت کیا ہے وہ اس تحقیق کا صحیح محل ہے اور وہاں سے آپ کو جواب بھی مل گیا کہ ہم نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہی تو جواب ہے جو ابلغ من الصراحتہ ہے اور بھی بعض حضرات نے مجھ سے یہ سوال کیا، ان کو جو جواب میں نے لکھا وہ یہی تھا کہ مجھ جیسے گوشہ نشین کو اس قسم کے اجتماعات سے جس کو میں گولڈن جبلی یا جشن سمین کہہ سکتا ہوں کوئی

مناسبت نہیں اس کی مقصدی افادیت پر میر اب تک شرح صدر نہیں۔

ایک کروڑ کے قریب مصارف کا اندازہ۔ دور دراز سے لوگوں کا سفر، پاسپورٹ ویزا کے مراحل بعض مشغول اشخاص کا اپنے اپنے کام چھوڑ کر آنا، شکوہِ مومنین تو کیا ہجومِ مومنین سے زیادہ نہ ہو گا۔

خصوصیت سے اپنے ان آثار قدیمہ اور روایات پارینہ سلفیہ کے مراکز میں یہ جدت پسندانہ جست و خیز اور شیشہ گری کے ایوانوں کی تقلید میں مردم سازی کے اداروں کی یہ ریس بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ اس سے قبل بھی اکابر کے زمانہ اجتماعات ہوئے، مگر ان کا ایک مقصد تھا جو یہاں مفقود ہے۔ صرف ایک تقریب یا طرب آزما تطریب ہے، اقبال نے کہا تھا:

تو ان کو سکھا خارہ شگافی کا طریقہ
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا

جس ادارہ کے اسلاف کا طرز خارہ شگافی پر یقین تھا، جن کے مدارس و مکاتب طاقت اور زندگی کا مرکز تھے (اور جن کا مقصد) انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا کرنا تھا، وہ اب:

طرب آشنائے خروش ہوں تو نوائے محرم گوش ہوں
کی دھن پر مست و مسرور ہوں

اس زحام کثیر میں کیا کوئی تعمیری پروگرام بنے کا یا بن سکتا ہے؟۔ دول اسلامیہ آج جس پر آشوب دور سے گذر رہی ہے خصوصیت سے فلسطین کا المیہ عربوں کا اپنی روایات سے بے نیاز ہو کر مغربی قافلوں کی گرد راہ بننے کے مظاہرے اور ماڈرن فکر و عمل۔ اس فضاء میں یہ تطریبی اجتماعات اس شور جوش کے ساتھ کیا ہو گا، بجز "نشستند و گفتند و برخواستند"۔ زمانہ حج میں موتمر اسلامی کے جلسے رابطہ اسلامی کے اجتماعات پر کیا ٹھوس مقاصد و منافع مرتب ہوتے ہیں ہمیں معلوم ہے۔

ہنگامے اور مصارف، ایک لاکھ انسانوں کی یہ حرکت و سفر کس ٹھوس مقصد کے لیے ہے، صرف و بذل مال و وقت سے مقابلہ موازنہ کیجئے پھر فیصلہ کیجئے

چند روز بعد ہم پوچھینگے کہ کیا پایا، کیا ملا؟ شادی بیاہ ختنوں عقیقوں کی تقریبات ٹھیک ہے معاشرتی رسوم ذہنی سرگشتہ، خمار رسوم و قیود، سفارش کریں گی کہ ضرور شرکت کیجئے، حدود متنبہ کرینگی کہ ان کو نہ پھلانگئے، مقاصد کا تقاضہ ہوگا کہ ان کو نہ بھلایئے۔ دیکھئے اسی نظر سے جو ان کی قدر اور حیثیت ہے اس لیے خود سراپا تذبذب ہوں کہ شریک ہوں یا نہ ہوں:

زندگی آداب لا یعنی میں ہے محصور غم
آہ اس دل سوزی پروانہ کا انجام کیا

مقاصد نظر سے اوجھل، مفاسد اقرب و محتمل، وسائل و مظاہر کا فریب کارانہ دخل، میں تو مایوس ہوں کہ ولی اللہی امداد اللہی تقافت مفقود، فکر و نظر محصور:

جب نہ پایا زور شاہی کے لیے
آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لیے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی
ہاتا پائی کو تصوف ہی سہی

(خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر اقبال کے درمیان موضوع تصوف پر جدال و مراء اور نزاع و خصام پر اکبر نے یہ کہا تھا)۔

یہاں شاہ ولی اللہ کا ارشاد یاد آتا ہے:

ایاک وغنی طاغ یتکلف بزی الاعاجم، و یتداخل فی مضاربة الجماجم

معلوم ہوا کہ خوب توڑ پھوڑ عمارتوں میں ہو رہی ہے، تزئین و تجمل، تکلف تحشم سطحی ظاہری نوک و پلک کی آرائش وزیبائش غرض لا یعنی اہتمامات مساجد و عامرة وھی خراب اجسام و قوالب کی آرائشگی، ارواح و قلوب سے بے اعتنائی:

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب
دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک

الحذر اے عقل کی سنجیدہ گفتاری حذر
جسم عالم ہو گیا خالی زروح زندگی

والسلام

نئی کتابیں، کچھ تذکرہ و تبصرہ

نور الحسن راشد کاندھلوی

نصف صدی قبل کا سفر نامہ، حج
تالیف - مولانا قاری حمید الدین سنبھلی
ترتیب حواشی - مولانا مفتی برہان الدین سنبھلی
ایک سو بارہ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ - قیمت درج نہیں
باہتمام مکتبہ حرم لکھنؤ

حرمین شریفین کے سفر نامے وہاں کے احوال و کوائف پر مرتب کتابیں اور تاریخ اہل ایمان اصحاب ذوق کے لیے مطالعہ کے محبوب ترین موضوعات میں شامل رہی ہے اور ہر دور میں اردو میں بھی حرمین شریفین کی زیارت و مشاہدات پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، ایسی ہی کتابوں میں سے ایک کتاب یا مختصر سفر نامہ زیر تعارف تالیف ہے۔

سنبھل (مراد آباد) کے ایک جید عالم اور قاری مولانا حمید الدین سنبھلی ۱۳۵۲ھ میں سفر حج و زیارت کی لئے حاضر ہوئے اور اس کی روداد قلم بند فرمائی، یہ متوسط سفر نامہ ہے مولانا حمید الدین نے سفر حرمین کے سب مراحل اور کیفیات کا ذکر کیا ہے، مرتب کی حج کے راستوں اور اخراجات پر بھی نظر ہے، کہاں کس وقت حاضری ہوئی اور مرتب پر کیا کیفیات گزریں اس کا بھی کچھ تذکرہ ہے بعض تعلیمی اداروں خصوصا مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کا تعارف ہے، حجاز کی اس وقت کی معاشی پسماندگی بھی پیش نظر ہے اس کی اسباب اور علاج یعنی دستکاری اور معاشی نمود کے چند اداروں کا بھی ذکر ہے۔ مولف کو اہل حجاز کی معاشی پریشانی اور فقر وفاقہ کی حالت سے سخت تکلیف ہوئی ہے ان کی دلی خواہش ہے کہ اہل حرم آسودہ حال اور خوش و خرم ہوں اللہ تعالیٰ نے ان کی اور ان جیسے مخلصین کی دعا قبول فرمائی، اگر وہ موجود ہوتے تو حرمین شریفین کی موجود خوشحالی رونق اور اہل حرم کی معاشی فراوانی کا مشاہدہ کرتے تو کیسے مسرور ہوتے۔

اگرچہ اس سفر نامہ میں مولف نے بہت زیادہ معلومات فراہم کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ مگر اس اختصار و اجمال کے باوصف جو چیز اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتی ہے وہ مولف کا دل بریاں اور جذبہ، محبت ہے، اس سفر نامہ کی بعض سطور سے آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔ یہی اس کتاب کی سوغات ہے اور فوائد و معلومات سے قطع نظر امید ہے اہل ذوق صرف اس مقصد کے لئے اس کتاب کو مفید پائیں گے اور اس کا ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جائے گا۔

کتابیات فراہی

مرتب ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اصلاحی
اسی صفحات کتابت و طباعت متوسط قیمت پندرہ روپے
ناشر: ادارہ علوم القرآن ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۹ ۔ علی گڑھ یوپی ۔

اردو میں کتابیات اور اشاریہ سازی کی روایت بہت پرانی اور وسیع نہیں ہے ۔ خصوصاً دینی موضوعات اور علماء کے احوال و سوانح کے حوالہ سے اشاریہ سازی بہت ہی کم ہوئی ہے، کتابیات فراہی اس سمت میں مفید اضافہ ہے ۔ فاضل مرتب نے علوم القرآن کے ایک ممتاز عالم مولانا سید حمید الدین فراہی (ولادت سنہ ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء وفات ۱۳۴۹ھ /۱۹۳۰ء) کی تصانیف، مولفات و مضامین اور مولانا کے احوال و کمالات اور ان کے علوم و تصانیف کی اہمیت و معنویت پر جو بھی لکھا گیا ہے کتابیات فراہی میں اس کی نشاندھی کی گئی ہے اور یہ کتاب مولانا فراہی پر دستیاب اکثر معلومات کی رہنما اور کلید ہے ۔ کتابیات فراہی مولانا کے علوم و افادات سے استفادہ کرنے والوں کے علاوہ علوم قرآن کے طلبہ کے لیے بھی لائق استفادہ اور قابل قدر ہے ۔

کچھ شبہ نہیں کہ یہ کتاب خاصی محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع کے اکثر مشتملات کی جامع ہے مگر ایک پہلو ایسا بھی ہے کہ جس کے اکثر مضامین و مولفات کا اس میں اندراج نہیں، اس سلسلہ کی اگر چند چیزوں کا ذکر آیا ہے وہ مجمل و نا تمام ہے جس کی وجہ سے کتابیات فراہی سے استفادہ کرنے والے اس موضوع کے بعض اہم مباحث اور متعدد تحریرات و مضامین سے ناواقف رہیں گے اور خطرہ ہے کہ معلومات مکمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ علماء کی ایک بڑی جماعت سے بدگمان ہو جائیں گے اس لیے اس سلسلہ کی بعض معلومات یہاں پیش کی جارہی ہیں ۔

یہ موضوع مولانا فراہی کی ایک نا تمام تحریر کی غیر محتاط اشاعت اور اس

سے پیدا سوالات و مباحث کا ہے۔ اس تحریر کی اشاعت کے بعد اس کے مندرجات کے حوالے سے علمائے کرام کا ایک مجموعہ فتاویٰ "الافصاح عن حقیقۃ الاصلاح" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں مولانا فراہی سے منسوب اس تحریر کے بعض مشتملات پر گفتگو کی گئی تھی۔ مولانا فراہی کے شاگردوں اور وابستہ فکر اصحاب نے ان فتاویٰ پر مختلف حیثیتوں سے اپنے خیالات ظاہر کیے جس سے اس تحریر کی حقیقت واضح ہوئی اور مولانا فراہی کی نسبت جو غلط فہمی ہو گئی تھی وہ دور ہوئی اور مولانا فراہی کے معتقدات و نظریات کا معتبر ذرائع سے علم ہونے کے بعد (دو تین کے علاوہ) سب علماء نے اپنے اپنے فتوؤں سے رجوع کرلیا تھا اور اس کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

کتابیات فراہی میں ان تحریرات و مضامین کا تو ذکر ہے جو اس مجموعہ فتاوی پر اظہار خیال کے طور پر لکھی گئی تھیں، لیکن یہ ذکر نہیں ہے کہ علمائے کرام نے اپنے ان فتاویٰ سے رجوع کر لیا تھا، علماء نے کیوں رجوع کیا اور اس سلسلہ میں کیا کیا مباحث زیر غور آئے، کون کون سی تحریریں شائع ہوئیں، اس کا کتابیات فراہی سے کچھ علم نہیں ہوتا، معلومات کی تکمیل کے لیے کتابیات فراہی میں ان سب تحریروں کا ذکر ضروری ہے اس قسم کے بیس پچیس مضامین اور تحریرات و رسائل شائع ہوئے تھے جس میں چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ الافصاح عن حقیقۃ الاصلاح۔ یہ پہلی تالیف یا مجموعہ فتاویٰ تھا جس کے بعد یہ بحث شروع ہوئی، اس مجموعہ میں درج فتاویٰ سے رجوع اور اس موضوع کی تحقیق پر مشتمل حضرت تھانوی کی کم سے کم چار تحریریں اور شائع ہوئیں جو یہ ہیں۔

۲۔ الف: التحقیق العجیب فیما یلزم المجیب، یہ حضرت کا اس فتوی سے رجوع پر مشتمل مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام وضاحتی مکتوب ہے، جو ماہ نامہ النور تھانہ بھون اور مکتوبات حسن العزیز میں چھپا تھا۔ بعد میں کئی اور موقعوں پر بھی شائع ہوا، مثلاً حکیم الامت مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۶۱ ھ طبع دوم، لاہور۔

ب : الایضاح لمافی الاصلاح، مرتبہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ۔

ج : ضمیمہء اولیٰ الایضاح، مرتبہ آغاز جمای الاول ۱۳۵۵ھ

د : ضمیمہ ثانیہ الایضاح مرتبہ ۷ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ

ہ : ضمیمہ ثالثۃ الایضاح مرتبہ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ

۲ ۔ اسی سلسلہ بحث سے وابستہ حضرت تھانوی کا ایک اہم مگر مختصر سا رسالہ اور بھی ہے مگر وہ ان رسال کے ساتھ نہیں چھپا، اس قصہ کے بعد ملاحۃ البیان فی فصاحۃ القرآن (در تنزیہ قرآن مجید از غیر انسب) کے نام سے مرتب ہوا اور ماہ نامہ النور تھانہ بھون، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ اور ۱۲ محرم ۱۳۵۸ھ میں چھپا اور حضرت مو ،لف کی ہدایت کے مطابق ان کے مجموعہ مضامین البدائع (طبع اول تھانہ بھون : ۱۳۵۲ھ) میں بھی شامل ہے۔

۴ ۔ ضمیمہ الافصاح عن حقیقۃ الاصلاح : مجموعہء مکتوبات علامہ سید سلیمان ندوی و مولانا ظفر احمد تھانوی ۔ اس میں طرفین کے گیارہ خط ہیں ۔ پانچ علامہ سید سلیمان کے، چھ مولانا ظفر احمد صاحب کے، آخری خط کے ساتھ مولانا ظفر احمد صاحب کا مولانا فراہی سے متعلق اپنے فتوی سے رجوع بھی شامل ہے ۔ یہ مراسلت علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے نظریات سے قطع نظر عقائد و کلام کے چند قابل قدر مباحث کے لیے بھی لائق مطالعہ ہے، یہ مجموعہ مکتوبات پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس موضوع پر علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا قاری محمد طیب (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ کے بھی متعدد مضامین اور تحریرات چھپی تھیں ۔ حضرات تھانوی کی ملاحۃ البیان فی فصاحت القرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخبار اہل حدیث امرتسر اور اخبار محمدی دہلی (مولانا محمد جونا گڑھی) میں بھی اس موضوع پر ایک ایک تحریر (اہل حدیث علماء کی) چھپی تھی ۔ اور اس سلسلہ میں حضرت تھانوی کی اہم تحریرات، علامہ سید سلیمان اور مولانا ظفر احمد کی مراسلت وغیرہ چھ رسائل کا ایک مجموعہ "الفرقان بین موجبات الکفر والایمان" کے نام سے ریواڑی (گڑگاؤں ہریانہ) سے

چھپا تھا مرتب سید مشتاق علی سکندر آبادی۔

نیز بعض تذکروں اور مؤلفات سے اس موضوع کی بعض تحریرات و مؤلفات کا ضمناً علم ہوتا ہے، مثلاً ملاحظہ ہو:

۱۔ حکیم الامت نقوش و تاثرات، از مولانا عبدالماجد دریا بادی ص ۴۵۷۔ ۴۷۶۔ طبع دوم (لاہور: ۱۹۶۷ء)

۲۔ تذکرہ سلیمان مرتبہ مولانا غلام محمد ص ۹۸۔۱۰۰، طبع اول (کراچی: ۱۹۶۰ء)

۳۔ تذکرۃ الظفر (سوانح مولانا ظفر احمد تھانوی) مؤلفہ مولانا عبدالشکور ترمذی ص ۱۹۲۔ کمالیہ (فیصل آباد: ۱۹۷۷ء)

یہ سلسلہ تالیفات و مضامین اگرچہ بعض پہلوؤں سے رنجدہ تھا۔ مگر اس کا ایک پہلو نہایت روشن اور بصیرت افزاء بھی ہے۔ اس وجہ سے مولانا دریا بادی نے اس قصہ کو "ناخوش گوار مگر بعض اعتبارات سے نہایت مفید سلسلہ" کہا تھا۔ بہر حال ان مضامین و تحریرات سے کسی کو اختلاف ہو یا اتفاق، لیکن کتابیات میں متعلقہ موضوع اور شخصیات سے متعلق سب ہی گوشوں کا تذکرہ آنا چاہیے۔ امید ہے آئندہ اشاعت میں یہ کمی دور ہو جائے گی۔

یہ اطلاع بھی مناسب ہے کہ اس قصہ سے متعلق مولانا ظفر احمد تھانوی کی دو اصل تحریریں مولانا قاری محمد طیب کا ایک مضمون نما خط (بجواب مکتوب مولانا سید ابوالاعلی مودودی) اور سید ابوالاعلی مودودی کا ایک خط (مکتوبہ ۱۱۔ جمادی الآخر ۱۳۵۵ھ) بنام قاری محمد طیب صاحب ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

ذکر جلیل

(مختصر تذکرہ مولانا شاہ جلیل احمد خاں شیروانی علی گڑھی)

تالیف مولانا مفتی وکیل احمد شیروانی۔

۶۴ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت درج نہیں۔

ناشر انجمن صیانت المسلمین جامعہ اشرفیہ فیروز پر روڈ لاہور پاکستان۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفاء میں بڑے بڑے صاحب کمال اور اہل علم و فضل ہوئے ہیں انہی میں سے ایک عالم مولانا جلیل احمد صاحب علی گڑھی تھے۔ جو اگرچہ نسبتاً غیر متعارف ہیں مگر ان کے کمالات اوروں سے کچھ کم نہیں۔ ذکر جلیل انہی کے احوال و کوائف کا مختصر مجموعہ ہے جس میں مولانا کے خاندان، تعلیم و تربیت، اساتذہ، اخلاق و عادات وغیرہ کا ذکر ہے نیز حضرت تھانوی سے عقیدت و محبت اور اجازت و خلافت کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں بعض واقعات بہت مفید اور موءثر ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے مفصل سوانح کے ترتیب کے ارادے کی وجہ سے مولانا کے متعلق بعض اہم معلومات اس مختصر تذکرے میں شامل نہیں کی گئیں اور جو باتیں اس میں درج ہیں ان کے بھی بعض گوشے نا تمام ہیں مثلاً:

تالیفات کے تحت ص (۵۵ پر) مولانا کی آٹھ تالیفات کا تذکرہ ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ مولانا کی کل تصانیف کی فہرست ہے حالانکہ خود اسی کتاب میں ص ۴۷ پر مولانا کی دو اور تالیفات نفیر جہاد اور ندائے غیب کے نام درج ہیں جب کہ تالیفات کی فہرست میں ان کا نام نہیں آیا۔ اور جن کتابوں کا تالیفات کے ضمن میں نام آیا ہے ان کا بھی مفصل تعارف نہیں کرایا گیا صرف نام لکھ دیے ہیں جس سے یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں کس طرح کی ہیں ان کی کیا اہمیت ہے، کیا موضوع ہے، یہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ، تالیفات میں ان سب باتوں کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ مولانا کی تالیفات میں حضرت تھانوی کے ملفوظات کے متعدد اہم مجموعہ ہیں الافاظات الیومیہ القول الجلیل جو حضرت کے اہم ملفوظات میں شمار کیے جاتے ہیں، اسی طرح مولانا کی ایک اور کتاب آثار رحمت بھی اس کی مستحق ہے کہ اس کا مفصل تعارف کرایا جائے کیونکہ یہ حضرت کے ایسے افادات کا مجموعہ ہے جس کا حضرت کے اور ملفوظات میں سراغ نہیں ملتا۔

نیز مولانا کی علمی خدمات کے تحت اس اہم خط و کتابت کا تعارف بھی ضروری تھا جس کو حضرت نے "تقطیف الثمرات فی تخفیف السکرات" کے نام سے

موسوم کر کے امداد الفتاوی (جلد ششم) میں شامل فرمایا، اس میں مولانا کے لیے حضرت کا نہایت اہم فقرہ بھی درج ہے اور مولانا کے متعلق حضرت کی کتابوں میں اور جو کچھ ملتا ہے اس کا بھی اس تذکرے میں حوالہ آنا چاہیے تھا۔

ذکر جلیل میں کتابت کی بھی متعدد غلطیاں موجود ہیں صفحہ ۲۴ پر مولانا جلیل احمد صاحب کی اجازت و خلافت کا سنہ ۱۲۱۵ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ مولانا کو مولانا شاہ مسیح اللہ کے ساتھ شوال ۱۳۵۱ھ / مارچ ۱۹۳۱ء میں اجازت ملی تھی۔ صفحہ ۵۲ پر دہلی کے احمد پائی کا ذکر ہے جو کتابت کی غلطی سے احمد بائی لکھا گیا ہے لیکن ان فرو گذاشتوں کی وجہ سے کتاب کی افادی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

از بندہ عبدالرشید محمود عفی عنہ — مکرمی حکیم صاحب ادید لطفہ — السلام علیکم و رحمۃ اللہ

والا نامہ سے مشرف ہوا۔ سائل بھی معقول۔ سوال بھی معقول اور قدرتی "کہ علاج کیا ہے"

غالباً آپ کی مراد تفصیلی واضح اور متعین تدبیر و علاج سے ہے۔ ورنہ اجمالاً تو میں نے عرض کیا ہی تھا کہ سب علاج اور سکا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی۔ یعنی انبیائی دعوت، ربط باللہ اور ایمان کا زندہ اور بیدار احساس

بے شک عملی طور پر اقدام تفصیل و توضیح طلب بھی ہے اور تعین و تنقیح کا خواہاں بھی۔ تشخیص کے بعد تجویز کا سوال قدرتی امر ہے۔ جو اجمالاً تو عرض کر دی گئی مگر تفصیل لیکر توجہ نہیں کیگئی۔ اسلیے کہ یہ تو نہ تو فرد واحد کا کام ہے۔ نہ خطاب عام اسکا محل ہے۔ یہ اجتماعی اور ہشیار فکر، بحث و نظر کا محتاج ہے۔ اسکیلئے شورائی اجتماع و اجتہاد اور اہل بصیرت کا تفکر آزما بورڈ درکار ہے۔ اسلیے کہ عمل کی راہیں بھی مختلف سامنے آئینگی۔ سوالات بھی گوناگوں پیدا ہونگے۔ آراء بھی حسب فکر متعدد ہونگی۔

مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی کے ایک خط کا ایک صفحہ

گرامی نامے

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری مہاجر مدنی، مدینہ منورہ۔

احوال و آثار کے دو شمارے وصول ہوئے میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کے اس رسالہ کے جاری ہونے کی بہت خوشی ہے یا اس بات کی خوشی زیادہ ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور یاد فرمایا، اور رسالے بھی ارسال فرمائے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی فراموش نہ فرمائیں گے۔ یہ آپ نے بہت مبارک اقدام کیا اور بہت اچھا سلسلہ جاری فرمایا۔ آپ کے یہاں جو مشائخ کی برکات اور مخطوطات اور مطبوعات کا ذخیرہ ہے اس سے عوام و خواص ہی کو متمتع اور مستفید ہونے کا موقع فراہم ہو گا آپ نے تقریباً بیس شماروں میں الفرقان لکھنؤ کے صفحات میں تقویۃ الایمان پر اپنی معلومات فراہم فرمائیں۔ ان سے تو مجھے خوشی نہ تھی، بلکہ میں اسے وقت کی اضاعت سمجھتا تھا۔ یہ نیا کام

محترم جناب حکیم عبدالحمید صاحب، چانسلر جامعہ ہمدرد، نئی دہلی،

چیرمین ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، انڈیا

سہ ماہی احوال و آثار کا دوسرا نمبر ملا، بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی قائم کر کے بزرگوں کے حالات، مواعظ اور علمی دینی آثار کو محفوظ کرنے اور ان کی اشاعت کا باقاعدہ بندوبست کیا ہے، جس سے علماء ہی نہیں پڑھے لکھے عام طبقہ کو بھی فائدہ اٹھانے موقع ملے گا۔ دعا ہے کہ یہ علمی و دینی خدمت نہ صرف جاری رہے بلکہ اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہو۔

ایک سال کا چندہ ارسال ہے قبول فرمائیں۔

خیر طلب عبدالحمید

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب۔ علی گڑھ

آج احوال و آثار کے دو شمارے ملے۔ بہت بہت شکریہ۔ دعا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور لوگ اس سے مستفید ہوتے رہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد سے آپ کا ذکر خیر ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ آپ کے کتاب خانہ سے استفادہ کروں۔ اب سفر کم کرتا ہوں دہلی جانے سے بھی طبیعت اباء کرتی ہے مگر کبھی کبھی مجبور آجانا پڑتا ہے۔

نذیر احمد

گو قرآن و حدیث کی خدمت کے درجہ میں تو نہیں ہے لیکن بہر حال قرآن و حدیث کے خدام کے احوال و آثار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مبارک اور مستحسن ضرور ہے۔ آپ کو چونکہ تاریخ سے دلچسپی ہے اور اپنے قصبات کے اہل علم کے احوال و آثار پر عبور ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ آپ اس خدمت کو پوری طرح بخوبی انجام دیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں کو قبول فرمائیں۔

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

عفا اللہ عنہ

حضرت شاہ سید نفیس الحسینی صاحب مدظلہ (نفیس رقم) لاہور۔ پاکستان

احوال و آثار نے بہت مسرور کیا، مضامین پڑھ کر بے اختیار دل سے دعائیں نکلیں اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔ احوال و آثار اور مکاتیب جن جن صاحبان کے نام بھیجے تھے پہنچا دیئے گئے۔ مجھے یہ بھی مسرت ہے کہ آپ نے احوال و آثار کے لیے

جناب محمد مسرور خاں (رٹائرڈ جج) بریلی، یوپی

احوال و آثار موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ آپ نے ہم تشنہ لبوں کو دینی معلومات اور بزرگان دین کی پاکیزہ زندگی کے بارے میں جانکاری دے کر بڑے ثواب کا کام کیا رسالہ واقعی بصیرت افروز اور روح افزاء ہے۔

جس کاوش اور محنت سے آپ نے اس کو جاری کیا ہے وہ قابل ستائش و آفرین ہے خدا تعالیٰ آپ کی سعی میں کامیابی دے۔

خاکسار، مسرور

جناب خورشید مصطفےٰ رضوی، امروہہ

احوال و آثار کا دوسرا شمارہ ملا، اس سے پہلا نہیں ملا البتہ قومی آواز میں تبصرہ نظر سے گذرا تھا۔ تبصرہ ہی سے رسالہ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب دیکھا تو واقعی جیسا سنا تھا اس سے کہیں زیادہ پایا، نادر و نایاب قلمی کتب کی اشاعت کا جو آپ نے بیڑہ اٹھایا ہے وہ بے حد اہم خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور دونوں جہاں میں سرخرو کرے۔

اس دینی اور قومی خدمت پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

خورشید رضوی

جناب حکیم خوشید احمد شفقت اعظمی

(اسسٹینٹ ڈائرکٹر انچارج، لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، منسٹری آف ہیلتھ، نئی دہلی)۔

احوال و آثار کا دوسرا شمارہ بصارت افروز ہوا، جسے دیکھ کر اس کے تابناک مستقبل کی پیش قیاسی بآسانی کی جاسکتی ہے۔ اتنے خلوص اور لگن کے ساتھ اتنا خوبصورت رسالہ رسالہ شائع کرنے پر صمیم قلب سے ہدیہ تہنیت قبول

میرے مکتوبہ خط کو اختیار کیا ہے۔ کمپوٹر کا اعجاز ہے کہ بھارت بھی جا پہونچا۔

احقر نفیس الحسینی۔ لاہور

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی۔ دہلی

سہ ماہی احوال و آثار کا دوسرا پرچہ ملا پہلا پرچہ اس وقت آیا ہوگا جب یہ خاکسار ہسپتال میں تھا۔ اس دور کی ڈاک گڑبڑ کا شکار ہو گئی۔ ماشاءاللہ آپ نے تو میدان میں نکلتے ہی دھوم مچادی۔ ترتیب، تالیف، اور مواد کا انتخاب تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، مضامین گھر کے اتنے ہیں کہ قارئیں پڑھتے پڑھتے تھک جائیں گے اور مضامین ختم نہیں ہوں گے، کام کی اہمیت کے پیش نظر قوم کے اصحاب نعمت کا فرض ہے کہ وہ تعاون کریں اور آپ نے اپنے شاہانہ (تصوف کی اصطلاح) حوصلہ سے کام لے کر جو سفید ہاتھی باندھا ہے وہ بندھا رہے، دانہ پانی کی کمی کے سبب رسی تڑا کر نہ بھاگ جائے۔

اخلاق حسین قاسمی

فرمائیے۔

گو کہ حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کا لائبریری ذخائر کے اعتبار سے بجائے خود انتہائی قابل قدر ہے، تاہم آپ کو اطراف و اکناف پر بھی نظر رکھنی چاہیے، اس جامع منصوبہ کے تحت بہت سے نوادرات دست برد زمانہ سے محفوظ ہوجائیں گے اور تشنگان علم دفن کی تشکیل کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ انشاءاللہ۔

شفقت اعظمی

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی (استاد فارسی) ایس ٹی ہائی اسکول، علی گڑھ

آج اتفاقاً ایک جگہ آپ کا خوبصورت و خوب سیرت مجلہ احوال و آثار نظر سے گذرا، بے ساختہ دل سے آپ کے لیے دعا نکلی، ماشاءاللہ آپ نے بہت اچھا رسالہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق مزید سے نوازے۔

رسالہ کے مضامین جستہ جستہ دیکھے، دوست نوازی نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت بات یہ ہے کہ آپ نے توقع کے عین مطابق مجلہ جاری کیا ہے، جملہ مشتملات اور حسن ظاہر و باطن کے اعتبار سے احوال و آثار قابل تشکر و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور اس مجلہ دونوں کو نظر بد سے بچائے، اور اس کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے آپ کی مدد فرمائے آمین

خیر اندیش رئیس نعمانی

پروفیسر اختر حسین نظامی (ریٹائرڈ پرنسپل) ریواں، مدھیہ پردیش

از درگاہ سلطان التارکین صوفی حمید الدین۔ ناگور، راجستھان

یہاں پر آپ کے رسالہ سہ ماہی احوال و آثار کا پہلا شمارہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی میں نے آپ کے رسالہ کو

مولانا حبیب الرحمن قاسمی، مدیر ماہنامہ ' دار العلوم ' دیو بند

احوال و آثار کے دونوں شمارے نظر نواز ہوئے، ماشاء اللہ دونوں ظاہری معنوی خوبیوں سے بھر پور ہیں۔ آج کے عہد میں جب کہ علم کا پروپیگنڈہ بہت ہے مگر علم ناپید ہوتا جارہا ہے، آپ کی یہ ہمت و کاوش لائق صد مبار کباد ہے کسی تعطیل کے موقعہ پر آپ کی لائبریری کے نوادرات سے دل و نظر کو روشن و شاد کروں گا۔

خیر اندیش حبیب الرحمن قاسمی

مولانا ریاض الحق قاسمی، مئو، یو پی

دو ہفتہ قبل آپ کا ارسال کردہ ہدیہ احوال و آثار باصرہ نواز ہوا، جو حسن صوری کے ساتھ مضامین کے تنوع و ندرت کے اعتبار سے بے مثال ہے سچ پچ اتنا عمدہ رسالہ میری نظر سے ابھی تک نہیں گذرا یہ آپ کے ایک ہی بیٹھک میں تمام و کمال پڑھ کر ختم کیا۔ بے شک تواریخ کے موضوع پر اردو میں آپ کے پرچہ جیسی مطبوعات کی ضرورت ہے، میں ایک عرصہ سے اضلاع مظفر نگر اور سہارنپور جیسے بردم خیز خطے کا دورہ کرنے کا خواہش مند تھا آپ کی تحریرات پڑھ کر وہ تمنا و آرزو دوبالا ہو گئی۔

اختر حسین نظامی

جناب جمیل اختر خاں صاحب ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔

تازہ پرچہ اور نوازش نامہ ملا، دونوں ہی مسرت کا باعث ہوئے۔ پرچہ کا سرورق جتنا دیدہ زیب ہے، یہی دیدہ زیبی اندر بھی ہوتی تو چار چاند لگ جاتے۔ سرورق پر تین سطر کے تعارف نے اکیڈمی کے پروگرام سے واقف کرایا۔ خدا کرے کہ نیک مقاصد میں حائل مشکلات رفع ہوں۔

والدہ مرحومہ کی جانکاہ خبر نے ملول کیا۔ خدا انھیں جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور آپ سبھی کو صبر جمیل!

کمپیوٹر کی کمپوزنگ میں اور جو کچھ ہو خطاطی کی خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی۔ کیا بہتر ہوتا کہ حالات کی سازگاری کے ساتھ رسالہ کسی اچھے خوش نویس سے لکھوایا جاتا اور اندرونی کاغذ بھی عمدہ استعمال کیا جاتا۔

ابھی سبھی مضامین تو نہیں پڑھ پایا پھر بھی جو کچھ نظر سے گذرا وہ خوب سے خوب تر ہی ہے۔ صفحہ ۱۲۱ پر پروفیسر ریاض الرحمن خاں شیروانی (سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی، علی گڑھ) لگتا ہے کمپوزنگ میں غلطی ہوگئی ہے۔ کشمیر علیگڈھ میں ہے یا علی گڑھ کشمیر میں؟ حواشی کا طریقہ وہی زیادہ صحیح ہے جو زمانے سے چلا آرہا ہے۔ حواشی دینے کا مقصد بھی تو یہی ہے کہ قارئین رواں مطالعہ میں اصل ماخذ کو جانتے چلیں مگر آخر میں دینے سے بار بار ورق

اخلاص اور اکابر اولیائے حقانی و ربانی سے عقیدت و محبت کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے، ہر سطر میں علوم نبوت و معرفت کا سمندر موجزن ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے تادیر قائم رکھے۔ انشاء اللہ اہل علم کو خریدار بننے پر آمادہ کروں گا۔
آغاز میں آپ کی والدہ صاحبہ کی وفات کی خبر سے بے حد افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

ریاض الحسن قاسمی

مولانا محمد عبید الرحمن ناظم ادارہ تعلیم و تربیت الاسلام وجے واڑہ

سہ ماہی احوال و آثار موصول ہوا۔ تفصیلی مطالعہ کا موقع نہیں ملا مگر ہمیشہ نظر کے سامنے رہا۔ اب تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا۔ بہت پسند آیا۔ آپ نے جو کام شروع کیا ہے بہت اہم ہے۔

محمد عبید الرحمن غفرلہ

گردانی کرنی پڑتی ہے قدیم طریقہ ہی میں زیادہ سہولت ہے۔

جمیل اختر خاں

اسرار احمد صاحب، منٹو روڈ کمپلکس، نئی دہلی

بحمد اللہ سہ ماہی احوال و آثار ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر زیر نظر ہے۔ رسالے کی تزئین و ترتیب اور حسن کتابت قابل تعریف ہے، مضامین کی سہل نگاری و جامعیت قابل تحسین ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد نہایت مبارک و مناسب ہے۔ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد بھی۔ خداوند قدوس سے التجا ہے کہ اس راہ میں آپ کے بڑھتے ہوئے قدم ہمیشہ گام زن و تازہ رہیں۔ اور آپ کے قلم کی روانی ہمیشہ جاری رہے، آمین
رسالہ کا سرورق جاذب نظر و خوش نما ہے۔ خدا حافظ۔

اختر اسرار احمد

جناب ناصر حسین پیرزادہ سری نگر، کشمیر

I received a sample copy of Ahwal-o-Aasar, I was pleased to see its contents. Your endeveour is indeed commandable.

Your Journal has taken the task of making the masses aware about the life of works of such luminaries, Hope your work will came up to the expectation, May Allah succeed you in your mission.

Nasir Husain

تصحیحات

۱۔ الف : شمارہ ۲-۲۷ پر اقصیٰ کو اقصا لکھا ہے یہ رسم قرآنی اور عربی قواعد کے خلاف ہے کمپیوٹر میں صحیح نہ آسکتا ہو تو قلم سے لکھا جائے رسم قرانی کے خلاف لکھنا جائز نہیں ہے۔

ب : حضرت تھانی کا سنہ وفات ۱۲۶۳ھ لکھا ہے جب کہ ۱۲۶۲ھ ہے۔

ج: حکیم عبدالمجید پتھر گڈھی کی ولادت ۱۳۶ لکھی ہے (صحیح ۱۲۳۶ھ ہے)

د : شب معراج میں رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عرش پر پہونچے کا تذکرہ، اور اس کو حدیثوں کی طرف منسوب کیا ہے یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے پھر اقصیٰ سے عرش مراد لینا مزید غلطی ہے۔ احقر کے نزدیک اس وعظ کا حضرت تھانوی کی طرف انتساب کرنا غلط ہے۔

اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ الا نہیں فرمایا الالیعبدون فرمایا۔ بتائیے صرف الا ہونے سے کیا معنی ہوجاتا اور عبد اور اجیر کا فرق کیسے واضح ہوجاتا۔ پرانی چیزوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری

از مدینہ منورہ

یہ صحیح ہے کہ ان واعظ میں بعض فرو گذاشتیں ہیں مگر یہ اس وقت کے واعظ ہیں جب حضرت کا ابتدائی دور تھا اور بعض کیفیات غالب تھیں، دوسرے اس کے قطعی ثبوت موجود ہیں کہ یہ حضرت کے ذاتی ذخیرہ اور مدرسہ امداد العلوم کے کتب خانہ میں رہا ہے اور اس پر مولانا احمد حسن سنبھلی کا ایک خط بھی چھپا ہے۔ اس لیے اس کا حضرت سے منسوب ہونا بلاتامل صحیح ہے اور اس پر بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہیں تاہم فروگذاشتوں پر وضاحتی حاشیہ ضروری تھا اس کوتاہی کے لیے راقم معذرت خواہ ہے۔

(نور)

۲۔ الف : ۲۶ پر کلاسوف تعلمون غالباً سہو ہے۔ منتخب آیات کی مناسبت سے کلا سیعلمون ہونا چاہیے تھا۔

ب : وعظ ۲ میں مسجد اقصیٰ سے عرش مراد لینا خلاف بداہت معلوم ہوتا ہے حضرت نے اگرچہ "یسبحون بحمد ربھم" سے استدلال کر کے قباحت کی نفی کی ہے لیکن اجماع کی مخالف، اور ملائکہ کی تسبیح تحمید سے عرش کے قریب مسجد کا ہونا کیوں کر لازم آئے گا۔؟

ج : ۴۱ پر شعر "گذرے جب اس تصنیف پر چالیس سال" اس میں لفظ "اس" زائد ہے۔

د : ایسے ہی ۶۲ پر ع "ہر کجا خواہی بکش جان مست جان تست" شعر اپنے وزن پر نہیں رہا۔ اس طرح اشعار کی تصحیح ہوجایا کرے تو بہتر ہے۔

مولوی محمد ناصر صاحب - ہرسولی

---

۲ - الف : شمارہ ا کے (جولائی اگست ۹۴) حواشی ۲۴ - ۲۵ کا متعلقہ صفحات ۸۱ - ۸۲ پر اشارہ و نشان نہیں ہے مگر حواشی ۲۴ - ۲۵ ص ۹۰ پر موجود ہیں۔

ب : شمارہ ۲ میں جو مضمون ۶۵ کے بعد ۶۶ پر آنا چاہیے تھا وہ غلطی سے ۶۷ پر آگیا ہے جس کی وجہ سے صفحات کی ترتیب گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اگلے شمارے میں اس کی تصحیح کر دیں۔

رشید احمد صاحب حیدری - میرٹھ

ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں، میں کشمیر یونیورسٹی میں وائس چانسلر نہیں رہا ہوں، بلکہ شعبہ، عربی و اسلامیات کا صدر رہا ہوں

پروفیسر ریاض الرحمن خاں شیروانی - علی گڑھ

میاں جیو نور محمد کے ہم عصر اہل جھنجھانہ کی ایک بیاض جس میں میاں جیو سے منقول

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، نور الحسن راشد کاندھلوی نے فائن آفسیٹ ورکس، دہلی سے چھپوا کر مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ سے شائع کیا۔

Registeration No. 40/AL/93TC

Quarterly "AHWAL-O-AASAR" (Urdu) Kandhla

Vol, 1 JAN. MAR. 1995 S/No. 3 No.

Editor

Noorul-Hasan Rashid kandhlavi

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

Mufti Elahi Bakhsh Academy

Maulviyan, Kandhla,
Distt. Muzaffar Nagar, (U.P.) India
Pin Code: 247775

 013182-2369

Printer, Publisher, Editor Noorul Hasan Rashid Printed at Fine Offset Works Delhi-6